علامہ سید سلیمان ندوی

کے چند نادر خطبات رسائل کا مجموعہ



مرتبہ
ڈاکٹر مولانا سید سلمان ندوی
صاحبزادہ علامہ سید سلیمان ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام
1-کے-3 ناظم آباد مینشن، ناظم آباد 1 کراچی 74600

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک ضروری گزارش!

معزز قارئینِ کرام! اس کتاب کو عام قاری کے مطالعہ، اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی اور ثوابِ دارین کے خاطر پاکستان ورچوئل لائبریری پر شائع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری یہ کاوش پسند آئی ہے یا آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے کوئی راہنمائی ملی ہے تو برائے مہربانی میرے اور میرے والدین کی بخشش کے لئے اللہ رب العزت سے دُعا ضرور کیجئے گا۔ شکریہ

طالبِ دُعا سعید خان



فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

ڈاکٹر مولانا سید سلمان ندوی صاحب
(ڈربن، جنوبی افریقہ)
(صاحبزادہ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

مولانا فضل ربی ندوی صاحب مجلس نشریاتِ اسلام کراچی اپنے علمی ذوق کی تکمیل کے لئے اپنے کاروبار تجارت کے علاوہ علمی کتابوں کی اشاعت کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ استاد مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی اشاعت ایک عرصہ سے کر رہے ہیں۔ اسی طرح والد ماجد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی اشاعت کا بھی اہتمام کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ اب وہ والد ماجدؒ کے چند منتخب مضامین کا ایک مجموعہ "علامہ سید سلیمان ندویؒ کے چند خطبات و رسائل کا مجموعہ" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

یہ مضامین ایک عرصہ ہوا دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مجلہ معارف میں شائع ہوئے تھے، چونکہ یہ مضامین موجودہ حالات کے تناظر میں اہمیت کے حامل ہیں اس لئے دوبارہ یکجا مرتب کر کے شائع کئے جا رہے ہیں۔ سنت کے موضوع پر یہ مضمون آج بھی ویسا ہی اہم ہے جیسا اس وقت تھا۔ اسی طرح امریکہ کی دریافت کے سلسلہ میں عام تصور

یہ ہے کہ کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ والد ماجد نے اس موضوع پر مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ عرب امریکہ کو کولمبس سے پہلے دریافت کر چکے تھے اور عرب ملاح امریکہ کی نئی دنیا سے واقف تھے۔

والد ماجد کا سفر گجرات تاریخی اہمیتوں کا حامل ہے۔ ہندوستان میں یہ اسلام کے تعارف و داخلہ کے سلسلہ میں اُن کا سفر گجرات تاریخی حقائق کی نقاب کشائی اور نشاندہی کے تناظر میں اہم اور دلچسپ ہے۔

کُل پاکستان مجلس تاریخ (All Pakistan Historical Socity) کا سالانہ اجتماع فروری ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان مرحوم کے دارالسلطنت ڈھاکہ میں منعقد ہوا تھا۔ اُس کا کلیدی خطبہ والد ماجدؒ نے دیا تھا۔ اس خطبہ میں میں مشرقی پاکستان والوں کو بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کی ہندوستان آمد کے وقت تک بنگالی کا رسم الخط فارسی و عربی تھا اور ساتھ ہی یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ پاکستان میں یکجہتی و اتحاد کے لئے اور پاکستان کی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لئے بنگالی کا رسم الخط ہندی کے بجائے دوبارہ عربی کر دیا جائے۔ مثلاً سندھی کا رسم الخط عربی ہونے کے باعث اس زبان سے ناواقف حضرات بھی کچھ نہ کچھ اُنسیت رکھتے ہیں اور اس کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بنگالی کا رسم الخط اگر عربی کر دیا جائے تو بنگالی زبان پر جو سنسکرت و ہندو تہذیب کا اثر ہے وہ ختم ہو کر اسلامی تہذیب و تمدن میں ڈھل جائے گی۔ اس خطبہ کے بعد مشرقی پاکستان کے اس وقت کے تناظر میں بنگالی زبان کے قوم پرستوں نے سخت احتجاج حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خلاف کیا تھا اور اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عناصر میں ایک عنصر زبان کی اجنبیت بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مضامین کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے تا کہ ان مختلف مسائل کا استحضار تاریخی حقائق کی روشنی میں ہو سکے۔

اشتراکیت و اسلام کا موضوع آج بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ آج بھی اس نظریہ پر بحث جاری ہے۔ آج امت مسلمہ کا سب سے بڑا مرض ایمان و ایقان کی کمزوری ہے۔ ایمان کے موضوع پر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اُن کی تقریر ایمان افروز ہے اور قابل توجہ ہے۔

مجلس نشریاتِ اسلام والد ماجدؒ کی کتابوں کے بھی ناشر ہیں۔ اُمید ہے کہ انشاء اللہ اُن کی ایسی کتابیں جو اس وقت معقود الطبع ہیں۔ مجلس نشریاتِ اسلام اُن کے دوبارہ اشاعت کا اہتمام کرے گی۔ علیہ توکلت والیہ انیب



سید سلمان ندوی

(کراچی پاکستان)

۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

اشتراکیت اور اسلام

اشتراکیت

خطبہ مسنونہ کے بعد

حضرات آج شب کے لئے جو عنوان رکھا گیا ہے اس کے متعلق مجھے کچھ اظہار خیال کرنا ہے۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ دنیا میں جماعتیں اور قومیں کسی خاص اصول پر بنتی ہیں۔ اور وہ اصول زیادہ تر ذہنی ۔ فکری اور نظری ہوتا ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ اس دنیا میں جو انسان آباد ہیں۔ ہر انسان علیحدہ علیحدہ ہے۔ ایک ملک کے انسانوں کا دوسرے ملک کے انسانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن جماعتوں اور قوموں کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی ایسا عقیدہ قائم کیا جائے کہ اس عقیدہ میں سب کے سب شریک ہوں۔ سب ملکر اس کو وحدت میں بدل دیں۔ جب تک جماعتوں میں یہ نہ ہو کوئی بڑا کام انجام نہیں پاتا۔

کسی کو کوئی ملک فتح کرنا ہے۔ تو ایک ایک سپاہی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ سپاہیوں کی فوج بناتے ہیں اور سپاہیوں کی فوج بنانے کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ حکومت کے قانون کے مطابق خیال کے مطابق نظریہ کے مطابق وحدت قائم کی جائے۔ اور پھر فوجوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ اور یہ نام اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ مختلف افراد کے درمیان اشتراک پیدا ہو جائے۔ اس وقت دنیا میں مختلف قوموں کی مختلف فوجیں ہیں۔ اور ان کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ فوج کے سپاہیوں کی انفرادی حیثیت کو نکال کر جماعت کی شکل دیکر نام رکھے جاتے ہیں۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں ان کی سلطنتیں اور حکومتیں ہیں۔ لیکن جماعت کیلئے قومیت کیلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مطلب ہو۔ ایک غرض ہو۔ ایک عقیدہ ہو۔ جو ایک رشتہ میں باندھ کر ایک بنا دے۔

اور اسی اصول پر دنیا کی ساری قومیں عمل کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں

پاک قوم کو مغلوب فرمایا۔ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔

مفسرین نے اور خود قرآن پاک سے ثابت ہے کہ یہ قوم یہود تھی ؟ جیسا کہ سورہ فاتحہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے غضب نازل کیا سورہ فاتحہ کو ہر شخص نماز میں پڑھتا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ لے پروردگار ہم کو اس راستہ پر چلائیے جس پر چلنے والوں پر تیرا انعام ہو۔ اس پر نہیں جس پر تیرا عذاب غضب نازل ہوا۔ یا جو گمراہ ہوئے جن پر عذاب نازل ہوا وہ یہود تھے۔ بنی اسرائیل تھے۔ حالانکہ یہ وہ گروہ ہے جس سے انبیاء پیدا ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کو مغضوب علیہم فرمایا ہے۔ ان سے ہمیشہ کیلئے نوعیت ملت کی اور ولائت قبلہ چھین لی گئی۔ جس میں سینکڑوں انبیاء پیدا ہوئے۔ جن کو فضیلت عطا فرمائی تھی۔ انہیں کو مغضوب فرمایا۔

اس کی کیا وجہ تھی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اللہ کے احسان کی قدر نہیں کی نافرمانی کی وہ کسی قسم کی ہدایت قبول کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ اور ان کے دل سخت ہو گئے۔

محمدؐ صلعم کی بعثت تک کا زمانہ ہدایت اختیار کرنے کے لئے مہلت کا زمانہ تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل سے نبوت ولایت چھین لی گئی۔

بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل کو سپرد کی گئی' قرآن پاک میں ذکر آیا ہے محمدؐ صلعم کی بعثت تک کا زمانہ آخری مہلت کا زمانہ تھا۔

مگر انہوں نے ہدایت قبول نہیں کی۔ اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔

معراج کی رات محمدؐ صلعم کی نبوت کا اعلان بیت المقدس میں ہوا کہ یہ آخری نبی ہیں۔ سارے انبیاء کی امامت حضورؐ پر تمام ہوئی ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ حضور کی نبوت تک بنی اسرائیل کو ہدایت پکڑنے کے لئے مہلت دی گئی تھی۔ جس

کوانہوں نے کسی صورت سے بھی قبول نہیں کیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے غضب نازل فرمایا۔ یہ غضب وعذاب اس قوم پر نازل فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ بہت فضیلت والی تھی(انی فضلتکم علی العالمین)جو سارے عالم پر فضیلت والی تھی۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ ظاہر ہوئے ایک انبیاء ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے ہدایت پاکر مخلوق کی رہنمائی کی دوسرا گروہ فلاسفروں کا ہے۔ جو مادی راستوں سے حقائق تلاش کرتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ دنیا میں ظاہر ہوئے۔ حکماء اور انبیاء۔

انبیاء تو اپنے روحانی فیوض وبرکات کی وجہ سے انسانوں کی رہنمائی فرماتے ہیں اور وحی الٰہی سے رہنمائی فرماتے ہیں۔

اور حکماء اپنے غور وفکر کی وجہ سے دنیا کی رہبری کرنا چاہتے ہیں۔ آج دنیا میں اللہ کا جو نام باقی ہے تو وہ انبیاء کا فیض ہے۔ انبیاء کی ہدایت اور رہنمائی کا نتیجہ ہے۔ حکماء کا نہیں۔

اکثر حکماء تو اللہ کے انکار کی طرف مائل ہیں مگر کوئی نبی ایسا نہیں ہے۔ جس نے اللہ کے سوا کسی کی دعوت دی ہو۔

انبیاء نے سیدھی راہ بتلادی اگر دنیا میں کہیں راست گوئی ہے۔ حق پرستی ہے جھوٹ کے گناہ کا احساس ہے دیانت ہے۔ امانت ہے۔ چاہے وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو جنگل میں چاہے پہاڑ میں چاہے صحرا میں گاؤں میں شہر میں تو یہ انبیاء کی وجہ سے ہے۔ یہ چیزیں حکماء کی وجہ سے نہیں آئیں۔ لیکن یہود ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے انبیاء کے راستہ کو چھوڑ کر نبوت کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنا راستہ تلاش کیا۔ اور یونان کے فلسفیوں کے راستہ کو اختیار کیا۔ خود بھی اختیار کیا۔ اور دوسری قوموں کو بھی اختیار کرنے کی تعلیم اور ترغیب دی۔ حضرت عیسیٰ جو انجیل لے کر آئے تھے۔ اس کو

یہودیوں نے مٹانا چاہا اگرچہ ان کے پاس آزاد سلطنت نہ تھی۔

معمولی سی سلطنت روم کے ماتحت تھی انہوں نے مخبری کی کہ یہ ایسے ہیں۔ ہنگامہ برپا کیا اور موجودہ انجیل کے مطابق انہوں نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرایا۔ ان کو پھانسی کا مستحق قرار دلوایا۔ مگر مجھے یہاں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ توحید کی تعلیم کے لئے دنیا میں آئے تھے۔ تثلیث وغیرہ غلط تھا۔ مگر ان کی تعلیم میں داخل نہ تھے۔ لیکن وہ یہودی تھے۔ جنہوں نے انجیل کو مٹایا موجودہ عیسائیت کی تشکیل کی۔ ان کا شیوہ ہے۔ کہ اب دین حق کو اپنی نوعیت سے برباد نہیں کر سکتے تو ساز شوق سے برباد کر دیتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کا سب سے بڑا مخالف سنٹ پال تھا۔ مشہور مقولہ ہے کہ عیسائی مذہب پال کی تعلیم و تلقین سے ہے۔ حضرت عیسیٰ کا آخری وقت تک مخالف رہا۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ میں جنگل میں سے آرہا تھا کہ ان کی روح اتری اور اس نے کہا کہ اے پال اے پال کب تک مجھ کو تکلیف دو گے۔ اور ان کی طرف سے بولتا ہوں تثلیث اس نے پھیلائی وہ اس سے خوش ہوا کہ اس نے حضرت عیسیٰ کے مذہب کو خراب کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ محمدؐ صلعم کے زمانہ میں یہودیوں نے ہر قسم کی کوششیں کیں لڑائیاں کیں مقابلے کئے کہ اسلام کو مٹادیں لیکن اللہ نے ان کو ناکام کیا یہاں تک کہ خیبر تک سے ان کی حکومت ختم ہو گئی۔ اور وہ اسلام کی ترقی کو نہیں روک سکے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں عبداللہ ابن سبا نامی یہودی ظاہر ہوا اور اس نے فتنہ برپا کر دیا حضرت عثمانؓ کے مخالفوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور وہ کامیاب ہو گیا اسی وجہ سے مسلمان آج تک دو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اسی کا سبب ہے۔ جو گروہ کہ انبیاء کے لئے تھا اور ان کی دعوت کے لئے تھا۔ وہ اس کی تردید کے لئے وقف ہو گیا۔

یہود میں ایک شخص سامری نام نے بچھڑا سونے کا بنایا اور کہا کہ یہ ہمارا خدا ہے۔

مصر میں بچھڑے کی عبادت ہوتی تھی وہاں گئو سالہ پرستی تھی۔ اس لئے سامری نے سونے کا بچھڑا بنا کر کہا کہ یہ ہمارا خدا ہے' جب حضرت موسیٰ کوہ طور سے واپس آئے تو اس کو توڑ دیا۔ اس کے بعد محمدؐ صلعم پر قرآن پاک نازل ہوا۔ اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا ہے کہ واشربوا فی قلوبھم العجل یعنی یہود کے دلوں میں اس ہی وجہ سے بچھڑے کی محبت دی گئی ہے' جس طرح ہندوستان میں بنیے وغیرہ قسم کے بہت سی قومیں ہیں جو سودی کاروبار کرتی ہیں۔ اسی طرح سے یورپ میں وہاں کے کاروباری بنیے یہودی ہیں۔ یہودیوں نے دنیا کے دولت روپے پیسہ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے۔ یہ قوم اپنے دماغی لحاظ سے بہت اونچی ہے۔ لیکن تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ اس لئے وہ چاہتی ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں اپنی طاقت قائم کرے۔ اور وہ اپنی دولت کی وجہ سے دنیا کے ہر ملک میں چھا جاتی ہے بڑی سے بڑی سلطنت کو قبضہ میں کر لیتی ہے۔ مختلف زمانوں کے اندر یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔

جن لوگوں نے افسانے پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے قرض کے بدلے میں مقروض کے جسم سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیا تھا۔ عیسائی ہی اس افسانہ کا مصنف ہے' اپنی خصلت کو یہ خود خوب جانتے ہیں۔ یہ اپنی دولت کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیلے مگر جب دوسری قوموں نے ان کی حرکتوں کو دیکھا اور سمجھا کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے تو وہ ان کو تباہ کرنے پر تل گئیں۔

پچھلے زمانہ کا واقعہ ہے کہ جرمنی سے نکالے گئے۔ جرمنی نے کہا کہ انہوں نے غداری کی ہے۔ اتحادیوں کی فتح کے لئے اپنی قوت صرف کرتے ہیں۔ یہ ساری دنیا کو اپنی دولت کی وجہ سے زیر دست بناتے ہیں۔ جب انہوں نے فلسطین حاصل کیا تو

شاید یہ سمجھے کہ انہوں نے طاقت سے حاصل کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے روپیہ پھینکا کر حاصل کیا۔ یورپ کی سلطنتیں ان کی مقروض ہیں اس وجہ سے وہ مجبور ہیں کہ ان کی مدد کریں۔ امریکہ کی آزادی سے انہوں نے فائدہ اٹھایا کارخانہ داریاں قائم کیں۔ اس زمانہ میں ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ یہودیوں کے بغیر کوئی کاروبار کر سکیں۔

یورپ کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ یورپ میں جو انقلاب پیدا ہوا۔ اس کے ہمراہ یہودیت کا ہاتھ کام کرتا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب ان کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ یہ انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک انقلاب کے بعد شاید دوسرا انقلاب ہمارے لئے مفید ثابت ہو۔ زمانہ جنگ میں دنیا مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے۔ لیکن ان سے حکومتیں قرض لیتی ہیں تاکہ اپنے آپ کو کامیاب کر سکیں۔

زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ جو آدمی آج لاہور میں ہے وہ کل فرانس میں ہو سکتا ہے۔ جو فرانس میں ہے یا کہیں ہے ایک ہفتہ میں ساری دنیا میں جا سکتا ہے۔ دنیا کے سارے بڑے بڑے کاروبار یہودیوں کے ہاتھوں انجام پا رہے ہیں۔

اشتراکیت کمیونزم جو ہے اس کا بانی مارکس یہودی تھا۔ وہی اس خیال کا بانی تھا۔ جمہوریت کا تخیل بھی انہیں کی پیداوار ہے جس میں سارا معاملہ انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

آپ ہیڈ ماسٹر صاحب کو راضی کر لیں۔ ڈائریکٹر تعلیمات کو راضی کر لیں۔ پیر صاحب کو راضی کر لیں بس لاکھوں آدمی آپ کو رائے دیں گے ووٹ دیں گے۔ اس کا تجربہ آپ کو لاہور کے انتخابات میں خود بھی ہوا ہو گا۔ کہ ایک کارخانہ دار کو راضی کر لینے سے کتنے ہزار مزدور آپ کو ووٹ دیتے ہیں۔ ووٹ دینے کے لئے آپ لاکھوں آدمیوں کو اس طرح تیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وہاں ہے کہ ایک یہودی

کارخانہ دار کو راضی کر لینے سے بہت سا کام ہو جاتا ہے امریکہ' لندن اور بڑی جگہوں میں یورپ میں یہودیوں کے بہت بڑے بڑے کارخانے اور کاروبار ہیں۔ کسی ایک فرم کو راضی کر لیجئے لاکھوں ووٹ مل جائیں گے بااثر باوقار اور مالدار لوگوں کو قبضہ میں رکھا جائے تو پھر ووٹ لاکھوں کی تعداد میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ پچھلے الیکشن میں امریکہ کے پریذیڈنٹ نے جو مینی فیسٹو (منشور) شائع کیا تھا۔ اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ یہودیوں کے معاملات کی پوری طرح سے مدد کی جائے گی دیکھئے اگرچہ یہود بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ مگر ان کو راضی کرنے کے لئے امریکہ کا صدر منشور میں یقین دلا رہا ہے کہ ان کے معاملات میں ان کی مدد کی جائے گی۔ اس سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہودیوں کا جال ساری دنیا میں بچھا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے صدر کو بھی ان کو راضی رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو لادینی حکومت کہلاتی ہے۔ سیکولر اسٹیٹ ہے۔

اس وقت دنیا میں تین قسم کی حکومتیں ہیں۔ بڑی حکومتیں عیسائیوں کی ہیں۔ یہ بڑی طاقتیں ہیں۔ ان کے بعد مسلمانوں کی حکومتیں ہیں۔ عیسائیوں کے دو حصے ہیں۔ ایک پروٹسٹن اور دوسرا کیتھولک انگریز ملک اپنے آپ کو پروٹسٹن کہتے ہیں۔ یورپ کے مغربی ممالک کیتھولک ہیں جہاں کیمونزم کا زور ہے۔ یہودی فلسطین کو اتنا بڑھانا چاہتے ہیں کہ سارے عرب کو ہضم کر لیں یہاں تک کہ حضورؐ کے زمانے میں جو خیبر وغیرہ ان کے قبضہ سے نکلا تھا۔ اس پر بھی قبضہ کر لیں۔

یہ تینوں حکومتیں نظریوں اور عقیدوں پر قائم ہیں۔ بظاہر ان حکومتوں کی بنیاد قومیت اور وطنیت پر ہے۔ مگر حقیقت میں قومیت پر نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اندر ایک فکر کی وحدت ہے نظریہ کا اتحاد ہے۔ روس میں کیمونزم کی وجہ کیا ہے۔ پہلے روس میں زار کی حکومت جو تھی وہ ترکستان سے لیکر فن لینڈ تک تھی۔ اس میں مختلف قومیں' نسلیں' زبانیں و مذاہب تھے زار کی حکومت ظلم و ستم پر قائم تھی۔ ساری قوموں کو تلوار

کے زور سے ایک شہنشاہی کا غدار بنایا گیا تھا۔ روس کے رہنما جو تھے۔ وہ اس بات کے خواہش مند تھے۔ کہ اس شہنشاہی کو زور و قوت کے بجائے کسی عقیدہ کی بناء پر قائم کیا جائے۔ اس کے لئے ان کو مارکس کے اصول پسند آئے۔ انہوں نے ان کو قبول کیا حالانکہ وہاں مختلف زبان کے لوگ تھے۔ مختلف مذاہب آباد تھے۔ تاہم اس نظریہ کی وحدت سے ان کے خواہش کے مطابق روسی شہنشاہی، شہنشاہی بن کر قائم ہو گئی۔ اور ان کا یہ انقلاب 18-1917ء میں کامیاب ہو گیا۔ فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ روسیوں نے اپنی قوموں کو متحد کر کے بزور شمشیر انقلاب پیدا کر دیا۔ اقتصادی نظام کے ذریعہ انہوں نے اپنی تمام قوموں کو ایک رشتہ میں پرو دیا۔ بظاہر یہ ایک اقتصادی نظام زندگی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ بھی ایک مذہب ہے۔ انہوں نے ہر قوم کو آزاد مان کر ان کی الگ الگ جمہوریتیں قائم کیں۔ ہر ایک کی اپنی زبان ہر ایک کی اپنی تہذیب، اس طرح انہوں نے روسی شہنشاہیت قائم کر دی اس طرح روسی شہنشاہیت نے اپنے لئے نیا پیغام نیا راستہ پیدا کر لیا۔ روسی شہنشاہی کی ایک انچ زمین بھی باہر نہیں گئی۔ اور سب باشندے بظاہر خوشی سے جمع ہو گئے۔ روسی ترکستان سے کریمیا لو تک سب روسی پرچم کے نیچے جمع ہیں۔ وہاں دس بارہ سلطنتیں قائم ہیں وہ اپنی اپنی زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ جو شخص چاہے نماز پڑھے جو نہ چاہے نہ پڑھے۔ بظاہر کوئی گرفت نہیں کی گئی نمازیں قائم ہیں۔ مگر دعوت دین اور خدا پرستی کی تبلیغ اور دعوت کی اجازت نہیں ہے۔ انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو انگریزوں نے اختیار کیا تھا ان کے یہاں بھی ہماری طرح نوجوان پیدا ہو رہے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ کس قسم کے ہوں گے۔ ہندوستان میں کانگریس نے وطنیت کا جذبہ پیش کیا۔ اس کی یہ مدح خوانی مختلف طریقوں سے ہو رہی ہے اس کی دعوت کئی کئی طرح سے ہو رہی ہے۔ حالات ایسے ہیں جس کی وجہ سے اس کی طرف توجہ ہو رہی ہے۔ کالجوں میں طلبا اور طالبات آزادی کی

راہ پر گامزن ہیں۔ ماسکو سے ہزاروں میل دور رہنے پر روس کی زندگی کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ کلمہ پڑھتے ہیں۔ اور دوسری طرف کیمونسٹ بھی بنتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان کو کیمونسٹ کہنا ایسا ہی ہے۔ جیسے یہودی مسلمان اور عیسائی مسلمان کیونکہ بالشویک صرف اقتصادی نظام نہیں ہے بلکہ وہ خود ایک مستقل مذہب ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک عقیدے میں منسلک ہیں۔ جیسے اسلام خدا کے نام پر مذہب ہے۔ یہ بے خدا کے مذہب ہیں۔ یعنی اللہ کے احکام کی، وحی کی، انبیاء کی نفی کی جائے۔ مادی فلسفہ کو فروغ دیا جائے بجائے اس کے کہ خدا کی عبادت کی جائے۔ فلاسفروں کی عبادت کی جائے۔

سب سے بڑی چیز کھانا ہے پیٹ کی مار ساری دنیا کو ہے انہوں نے منزل مقصود پیٹ کو بنایا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بھی نعرہ لگایا ہے۔

اس کے مقابلہ میں سرمایہ دار قوموں نے سرمایہ دارانہ نعرہ لگایا ہے۔ ہم لوگ جو مشرقی ہیں۔ ان کے نعروں کا اعادہ کر رہے ہیں۔ ہمارے وزراء کی زبان سے بھی سنا ہوگا کہ ہم لوگوں کا معیار زندگی بڑھائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو کھانے پینے کو ملے یہ بے جانے بوجھے رٹ لگائی جارہی ہے یہ حقیقتاً جواب ہے۔ کیونسٹوں کے نعروں کا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرے گی۔ ہم تو سرمایہ داروں کے جوابی نعرے کی نقالی کرتے ہیں۔ اور وہ ایسا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کسی قول کو دہرا دیا جائے۔ مجھے اپنے بچپن کی بات یاد آتی ہے کہ ایک دیوان میں پڑھا تھا شعر یاد نہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ جب انسان کا ایک کام ہو جائے تو پھر اس کی ضرورت پڑتی ہے ایک کے بعد دوسری پھر تیسری چوتھی۔ اسی طرح انسان مبتلائے غرض و مطلب ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے استاد نے وضاحت سے مطلب یہ بتلایا تھا کہ تمہارے پاس سواری نہیں ہے۔ سواری کے لئے گھوڑا خرید لیا اب ایک چیز

کے بعد دوسری چیز کی ضرورت پیدا ہوئی کہ دانے گھاس کے لئے سائیس ہو۔

اسی طرح یہ ہے کہ آپ کا معیار زندگی بڑھایا جائے گا کہ آپ کو چائے بھی پلائی جائے گی پھر میز کرسی کی ضرورت پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہے گا۔ انسان اگر یہ چاہے کہ ساری دنیا پا کر بھی وہ خاموش ہو جائے تو ممکن نہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ انسان کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

معیار زندگی کو بڑھانے کے لئے آپ دیکھتے ہیں کہ مل والے اسٹرائک کرتے ہیں۔

میں بھوپال میں تھا۔ مل کے مزدوروں نے اسٹرائک کیا اور عوام سے چاہا کہ مدد کریں تو عوام نے کہا کہ ہم تمہاری مدد کر کے کیا کریں گے جو لٹھہ 4 آنے گز آج ملتا ہے وہ کل ساڑھے چار آنے بکنے لگے گا۔

اگر آٹھ روپیہ روز ملتے ہیں اور پھر سولہ ملنے لگیں تو بھی وہ اپنے بیوی بچوں کو لے جا کر نہ دیں گے بلکہ اب اگر ہفتہ میں دو مرتبہ سینما دیکھتے ہیں تو پھر چار مرتبہ دیکھنے لگیں گے اگر پہلے دس پیالی چائے روز پیتے تھے تو پھر بیس پینے لگیں گے گھر لے جا کر نہیں دیں گے تجربہ اس کا شاہد ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ یہ جو نعرہ لگایا جاتا ہے کہ بالشویک حکومت نے زمین کا مالک کاشتکاروں کو بنا دیا ہے بالکل غلط ہے وہاں تو ایسا ہے کہ جتنا غلہ پیدا ہو وہ سب حکومت کا ہے۔ چاہے لوگ بھوکے مریں۔

اور ہمارے ہندوستانی اور پاکستانی نوجوان یہیں سے بیٹھے ہوئے "ارض ماسکو" کو سلام بھیجتے ہیں۔

ایک کتاب جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گئی ہے۔ اس کو لکھنے والا روسی

ہے۔روسی سفارت خانہ کے ساتھ امریکہ بھیجا گیا ہے۔وہاں جا کر وہ روسیوں کا ساتھ چھوڑ کر امریکی ہو گیا اور اس نے انگریزی میں کتاب لکھی ہے۔اس کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاشتکاروں پر کتنا ظلم روس میں ہو رہا ہے وہاں یہ قاعدہ ہے کہ سارا غلہ حکومت کے پاس جمع کیا جائے اور کسی کو نہ دیا جائے ایک تولہ بھی کم نہ ہو چاہے لوگ بھوکے مرتے رہیں۔اور حیرت انگیز قصے بیان کئے ہیں۔

اقبال رحمت اللہ علیہ شاعر اسلام سمجھے جاتے ہیں۔ان کے کلام کے اندر یہ چیزیں ہیں۔

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

کیا یہی وہ اقبال ہیں جو اسلام کا گانا گاتے ہیں۔پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ بالشوئک ازم کی تعریف میں قصائد لکھتے ہیں۔

انقلاب۔اشتراکیت۔کسان' مزدور' عرق پسینہ کا ذکر کرتے ہیں یہ نیا ادب ہے۔

میں نے ایک مشاعرہ میں اس قسم کی نظم سن کر یہ کہا تھا کہ آپ لوگ پرانے شاعروں پر تو اعتراض کرتے تھے کہ حسن و عشق گل و بلبل کی رٹ لگاتے ہیں تم نے نئے الفاظ گھڑ لئے ہیں۔انقلاب' مزدور 'کسان' مزدور کی لڑکی تم مزدوروں کی مدد نہیں کرتے بلکہ اپنی لیڈری چاہتے ہو۔مسلمان حکومتوں میں اشتراکیت کا پرچار کیا جاتا ہے۔

ایک اخبار یہاں سے نکلتا ہے۔کبھی کبھی پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے پہلے صفحہ پر تو کلمہ لا الہ الا اللہ ہوتا ہے۔مگر دوسرے صفحہ پر بالشوئک کا قصیدہ' یہ کیا تضاد ہے جو اخباروں میں نظر آتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان تو مسلمان دوسری چیز پر

لائے ہیں۔ لیکن اخباروں کو بیچنے کے لئے دوسرا طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں۔

بالشویک نے اشتراکی نظام اپنے پیٹ کو رکھ کر بنایا ہے مارکس کی کتاب ان کا صحیفہ ہے۔ سرمایہ داروں نے اقوام متحدہ بنائی ہے۔ اتحادیوں کا منشور جو ہے۔ وہ ان کا صحیفہ ہے مگر عمل کے لئے نہ وہ عمل کرتے ہیں۔ نہ یہ کرتے ہیں لیکن آوازیں لگاتے ہیں۔ نعرے لگاتے ہیں مگر مسلمانوں کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان کا کوئی نعرہ ہے نہ کوئی دعوت ہے۔ نہ صحیفہ ہے اسلامی ملکوں کا زیادہ حصہ اتحادیوں کے قبضہ میں ہے۔ انہوں نے اقوام متحدہ کے منشور پر بھی دستخط کر دیئے ہیں اور اسلام کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔ چاہے اس میں مصر ہو۔ چاہے شام ہو چاہے انڈونیشیاء ہو۔ ہندوستان ہو یا پاکستان ہو' ہر جگہ یہ تضاد ہے۔

میں نے انگریزی کا ایک اخبار پڑھا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے اس میں پاکستان کے متعلق لکھا تھا کہ پاکستان عجیب تذبذب میں مبتلا ہے۔

ایک طرف تو وہ اسلامی دستور بنانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف برٹش پارلیمنٹ کے طریقہ کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ اور دونوں کو جمع کرنا اتنا مشکل ہے کہ اس سے عہدہ برآں ہونا ناممکن ہے اس سے معلوم ہوا کہ انگریز دماغ بھی اس تضاد پر غور کرتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومتیں جو دنیا میں ہیں۔ اسی مالیخولیا میں مبتلا ہیں۔

کیونکہ رعایا مسلمان ہے۔ اس لئے اسلام کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن وزراء اور حکومت جمہوریت پر عقیدہ رکھتے ہیں دونوں کیلئے یہ ملغوبہ فکر کا باعث بنا ہوا ہے۔ حالانکہ جس طرح بالشویکوں اور اتحادیوں نے اپنے اپنے الگ نظریئے اور نظام قائم کر لئے ہیں اور اس میں یہ نہیں دیکھا کہ یہ کس کے خلاف اور کس کے موافق ہے۔ اسلامی حکومتیں بھی اس طرح کامیاب ہو سکتی ہیں کہ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ دوسرے کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اپنا وہ نظام ہدایت جو محمدؐ صلعم نے پیش کیا ہے اس کو قبول کریں اور

پوری طرح سے عمل کریں۔

بالشوئک نے فرانس کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کی اتحادی اقوام نے منشور بنایا تو انہوں نے یہ کوشش نہیں کی کہ اس سے بالشوئک خوش ہو جائیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے نظریئے کو خوش نہیں کر سکتا۔ جب تک ہم تضاد کی زندگی سے باہر نہیں آجائیں گے۔ ہم اپنے نظام کو اپنی ملت کے مطابق نہیں بنا سکتے۔

حضرات آپ سب کو معلوم ہے کہ اسلام کی بنیاد حکم پر ہے۔ اور اس وقت دنیا کی ہر چیز انقلاب پذیر ہے تغیر پذیر ہے۔ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں تغیر نہ ہو رہا ہو۔

بالشوئک نے پیٹ کو قبلہ بنایا ہے یہ بھی بدل سکتا ہے کہ ہم نے جتنا پیٹ پیٹ پکارا اتنا ہی دنیا کا حال خراب ہو رہا ہے۔

بالشویکوں نے پیٹ کی پکار شروع کی تو دنیا میں غلہ کا کال پڑ گیا۔ ہر جگہ غذا کی وزارتیں قائم کی گئیں۔ یورپ کی قوموں کی تواریخ کو ایشیاء کی تاریخ کو مصر و یونان اور مسلمانوں کی تواریخ کو پڑھ ڈالو کہیں وزیر غذا کا پہلے پتہ نہیں چلے گا دنیا نے پیٹ پیٹ پکارا اور جو عقیدہ پیٹ کا رکھتے تھے وہ سب اس میں مبتلا ہو گئے۔ غلہ دنیا سے کم ہو تا جا رہا ہے ساری دنیا پر پیٹ چھا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے آپ کو رازق کہا ہے۔ لیکن آج کا فلسفہ یہ ہے کہ حکومت کے ہاتھوں میں رزق ہے (ومامن دابة فی الارض الا علی اللہ رزقها کی جگہ علی المکرمہ رزقها) کی پکار ہے۔

ہندوستان کے غلہ کی حالت آپ کو معلوم ہے اور انگریز کے زمانہ میں غلہ کی کیا حالت تھی۔ جیسے جیسے پیٹ پیٹ پکارا جانے لگا۔ زمین کی برکت غائب ہو گئی۔ جو کوشش کی جاتی ہے الٹی پڑتی ہے۔

حضرات۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جو نظریہ اور نظام محمدؐ صلعم کے ذریعہ سے آیا ہے اس کو اپنائیں۔ اور اس پر عمل کریں۔ کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے دوسری قوموں کو بھی ہدایت عطا فرمائے۔

ہمارے یہاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قحط پڑا تھا۔ مدینہ طیبہ میں اس کو عام رمادہ کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے اول تو ان کا کھانا ہی کیا تھا انہوں نے سالن چھوڑ دیا۔

اس کے بعد مصر کے گورنر (عمرو بن العاص) کو حضرت عمرؓ نے غلہ کے لئے خط لکھا انہوں نے غلہ بھیجا۔ اور لکھا کہ میں غلہ بھیج رہا ہوں اتنا غلہ بھیجتا ہوں کہ قطار کا ایک اونٹ مدینہ طیبہ میں ہوگا اور اس کا آخری اونٹ مصر میں۔ دیکھئے انتظام اس کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (فی السماء رزقکم وماتوعدون) کہ آسمانوں میں تمہارا رزق ہے۔ زمین تو بے شک آپ کے پاس ہے آپ زمین کو قابل کاشت بنا سکتے؟ لیکن پیدا کرنے کی طاقت نہ آپ میں نہ کسی بادشاہ میں آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے اندر بہت سی زمینیں قابل کاشت بنائی گئیں۔ مگر غلہ میں کمی ہوگئی جو کام اللہ تعالیٰ کا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کس طرح سے کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ عقل اور سائنس سے غلہ کی پیداوار بڑھالیں مگر یہ عقل کی باتیں دماغ میں ڈالنے والا بھی تو وہی ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

ٹریکٹر سے پہلے ایک آدمی بیلوں سے کاشت کرتا تھا لیکن اب ٹریکٹر کے لئے سارے گاؤں کو جمع کرنا ہوتا ہے اس پر ہندوستان میں بیکار روپیہ صرف ہوا۔ اللہ سے روگردانی کرکے کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ فریب کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔
حضرات اسلام نے جس نظریہ پر پیدا فرمایا ہے وہ مادی نہیں ہے جو نظریہ مادی طریقہ

سے پیدا کیا جائے گا وہ دو چار سال کے بعد بیکار ہو جائے گا لیکن اسلام کا جو رشتہ ہے وہ ناقابل تبدیلی ہے۔ ایک دائمی ملت کی بنیاد دائمی ہی نظریہ پر قائم کی جا سکتی ہے۔ اسلام کی بنیاد اللہ کی توحید انبیاء کی سچائی ان کی کتابوں کی صداقت اور انسانوں کے صحیح عمل پر ہے۔ اسلام یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ انبیاء کی تصدیق کیجئے محمدؐ صلعم کو خاتم النبین مانا جائے۔ اور اللہ کے فرشتوں کو کتابوں کو مانا جائے ان سب پر ایمان لایا جائے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی۔ اس پر یقین رکھیئے دوزخ اور بہشت میں جانا ہو گا۔ اس پر ایمان رکھو' اسلام نے اپنی بنیاد اسی پر رکھی ہے۔ امت محمدؐیہ آخری امت اور ملت ہے۔ اسی لئے جو نظام ہدایت باری تعالیٰ نے مکمل اور دوامی بنا کر بھیجا ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں بدل سکتی ہیں۔ لیکن اللہ ایک ہے انبیاء سچے ہیں اللہ خالق حقیقی ہے کبھی نہیں بدل سکتیں یہ کبھی کھوکھلی نہیں ہو سکتیں دنیا کا کوئی مادی نظریہ آپ کے اندر خیر پیدا نہیں کر سکتا نیکی اور خیر کا جذبہ تو اس وقت پیدا ہو گا جب اللہ کے بتلائے ہوئے اور رسول صلعم کے لائے ہوئے راستہ پر چلو گے' جب تک اسلام کے راستہ پر مسلمان چلے آفات مصائب سے محفوظ رہے اور جب سے مادہ پرستی کا دور شروع ہوا قومیت کی بنیاد پڑی۔ پیٹ کا سوال پیدا ہوا۔ بدکاری' تعصب' حق فروشی' بد دیانتی شروع ہو گئی اور ابھی کیا ہے۔ ابھی تو آغاز ہے مجھ کو لاہور کا حال تو معلوم نہیں ہے کراچی کا معلوم ہے کہ آج فلاں عورت قتل ہو گئی ہے۔ ابھی آغاز ہے' فحاشی اور بدکاری کا یہ عالم ہے پھر اس کا انجام کیا ہو گا (آوازیں لاہور میں بھی ایسا ہی ہے) یورپ کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہاں جمہوریت ہے لیکن اس جمہوریت نے واقعی اخلاق بلند کر دیئے ؟۔

کیا انکے اخلاق بلند ہیں۔ وہ سچے ہیں۔ کیا وہ اپنے اندر روحانی نور پیدا کر سکے۔ یہ نظریہ روح کو اور اخلاق کو بلند نہیں کرتا۔ یہ دنیا کی تمناؤں کو بلند کرتا ہے بے ایمانی اور بدکاری کو اضافہ کرتا ہے ملت مسلمہ ساڑھے تیرہ سو سال سے ہے۔ ہر قسم کے دوروں

سے گزری لیکن اتنی عریانی فحاشی' بدکاری سامنے نہیں آئی جتنی آج ہے۔ آج اخباروں میں رسالوں میں' شعروں میں۔ سینماؤں میں' ہوٹلوں میں' کلبوں میں جہاں دیکھئے بجز ترغیبات جنسیہ کے کچھ نہیں۔

خواتین کے جلسے ہوتے ہیں۔ ان کا نتیجہ بھی بجز فواحش کی نمائش کے کچھ نہیں۔ یہاں کنواریوں کا ایک کلب بنایا جارہا ہے یہ لڑکیاں عمر بھر نکاح نہیں کریں گی۔ راولپنڈی سے کنواروں کے کلب کی بارات آئے گی۔ اس گمراہی کا کیا نتیجہ ہو گا۔ مسلمانوں نے اپنے نظریہ' عقیدے' ہدایت کو چھوڑ دیا اور دوسروں کے اختیار کر لئے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر لینن اور اسٹالن کی امامت پر ایمان لایا جارہا ہے میں اپنی تقریر کے آخر میں ایک سوال کرتا ہوں کہ ہر مسلمان نماز پڑھتا ہے۔ کیا وہ سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا ہے آپ کی زبان تو یہ کہتی ہے کہ اے خدا اس کو یہودیوں کے راستہ پر نہیں عیسائیوں کے راستہ پر نہیں۔ بلکہ انبیاء کے محمدؐ رسول اللہ کے راستہ پر چلا لیکن عمل آپ کا کیا ہے؟

نوجوانوں کی وضع قطع دیکھئے اخلاق عادات دیکھئے کیا وہ انبیاء کرام کے راستہ پر چلیں یا یہودیوں کے اور نصاریٰ کے راستہ پر چلیں'

ان کا قبلہ و کعبہ بیت الحرام ہے۔ یا نیویارک' لندن' اور پیرس ہے۔

ہم نماز پڑھتے ہیں۔ اور دعویٰ مسلمانی کا کرتے ہیں۔ مگر طریقے یہودیوں اور عیسائیوں کے پسند ہیں۔ یہ کب ایمان و عمل کا تضاد ہے۔

رسولِؐ وحدت

دوست اور دشمن، موافق اور مخالف سب کو تسلیم ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی سب سے پہلی اور آخری خصوصیت توحید کی تعلیم ہے، مگر اب تک اس توحید کے لفظ کو ایک خاص اصطلاح میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ نے خدائے تعالیٰ کی وحدت کی کامل تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کی۔ لیکن آیئے آج ہم اس لفظ کو تحلیل کریں اور دیکھیں کہ آپ نے وحدت کی تعلیم کس کس رنگ سے پیش کی اور کس کس پہلو سے تکمیل کی ہے۔

وحدتِ الٰہی

دنیائے وجود کا سب سے بڑا طلسم، وحدت و کثرت کی نیرنگی ہے، ہم کو بظاہر ہر طرف کثرت ہی کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ ظاہر بین نگاہیں کثرت کی انہیں نیرنگیوں میں الجھ کر اور واحد کو کثیر سمجھ کر موحد سے مشرک بن جاتی ہے مگر حقیقت شناس نگاہیں کثرت کے رنگارنگ پردوں کے پیچھے وحدت کا جلوہ دیکھ لیتی ہیں۔ دیکھنے والوں کو آسمان زمین، پہاڑ، جنگل، دریا نظر آتے ہیں۔ پھر آسمان میں آفتاب ماہتاب، سبع سیارہ اور دوسرے ستارے دکھائی دیتے ہیں، زمین میں انسان، حیوان، درخت، پہاڑوں میں چٹانیں اور غار، دریاؤں میں روانی، سیرابی اور موجیں نظر آتی ہیں، تو انسانوں نے ان سب کو کثرت کی جلوہ انگیزیاں سمجھ کر ان میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا خدا اور دیوتا بنایا، کسی نے آفتاب کی پوجا کی، کسی نے ماہتاب کو، کسی نے دریا کو اور کسی نے پہاڑ کو لیکن موحد اعظم کی نگاہوں نے ان کثرتوں کے پیچھے وحدت کا جلوہ دیکھا اور پکار اٹھا کہ میں ان کے نہیں بلکہ ان سب کے ایک اور تنہا خالق کے آگے سر جھکاتا ہوں۔

انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔

میں نے اپنا منہ ان سب کی طرف سے پھیر کر اس کی طرف کیا جو ان آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، موحد بن کر اور میں دوسروں کو خدائے برحق کا ساجھی نہیں مانتا۔

دنیا کے سارے علوم و فنون اور فلسفہ و سائنس کی تمام شاخوں کی پوری کوششیں اور تحقیقیں صرف اسی ایک اصل کی فرع ہیں کہ ان رنگارنگ کثرتوں میں وحدت کی تلاش کی جائے اور اس ایک علت کا پتہ چلایا جائے۔ جس کی تمام کثرتیں اثر اور نتیجہ میں جس علم و فن میں جس حد تک حقیقت کی منزل قریب ہوتی جاتی ہے وحدت کا چہرہ نمایاں سے نمایاں تر ہوتا جاتا ہے۔

عہد جاہلیت میں انسان ہر کام کا الگ الگ دیوتا مانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ دنیا کے تمام افراد اور واقعات کا تعلق علیحدہ علیحدہ فاعلوں اور موثروں سے ہے اور وہ ان سب کو پوجتا تھا۔ بیماری کا الگ خدا تھا بلکہ ہر بیماری کا ایک ایک الگ دیوتا تھا جس کی پرستش ہوتی تھی۔ جنگ کا الگ، صلح کا الگ، قحط کا الگ، پیداوار کا الگ، علم کا الگ، خیر کا الگ اور شر کا الگ، ایک ایک دیوتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ سائنس اس باطل کا انکار کرے دین حق نے اس کے تاروپود بکھیر دیئے اور تعلیم دی کہ وہ ایک ہی جو آسمان سے زمین تک سب پر فرمانروا ہے اور ایک ہی حکم ہے جو عرش سے فرش تک جاری ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (زخرف)	اور وہی ایک ہے جو آسمان میں اور وہی ایک ہے جو زمین میں فرمانروا ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو توحید کا مغز و جوہر ہے صلح و جنگ، دولت و افلاس رحمت و زحمت کامیابی، ناکامی، غرض دنیا کے ہر کام اور ہر شے کا تعلق اسی ایک ذات سے ہے۔ جو وحدہ لاشریک ہے۔

اس تعلیم نے دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، فرشتوں، پیغمبروں، ولیوں اور شہیدوں کی طوائف الملوکیوں کا خاتمہ کر کے آسمان و زمین میں صرف ایک شہنشاہی قائم کی اور تمام عالم کو ایک نظام ربانی کے قبول کرنے کی دعوت دی۔ دنیا کے مختلف

مذاہب کو لیکر جو انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ اسی سب سے بڑی حقیقت کو لیکر آئے مگر افسوس ہے کہ یہ حقیقت پوری طرح واشگاف ہو کر لوگوں کے سامنے نہیں آئی اور جن کے سامنے آئی وہ بھی اس کو بھلاتے رہے آخر دنیا کو دنیا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار رہا کہ آپ کی بعثت اس حقیقت کو اس وضاحت اور شرح و تفصیل اور تکمیل کے ساتھ پیش کرے کہ دنیا اس کو قبول کر کے پھر بھلا نہ سکے۔

چنانچہ توحید یا وحدت الٰہی کی تعلیم جس تفصیل اور تشریح کے ساتھ آپ نے دی وہ آپ کی تعلیم کی امتیازی خصوصیت بن گئی ہے۔ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لحاظ سے بھی واحد ہے اور اپنی صفات کاملہ کے لحاظ سے بھی واحد و منفرد ہے اور اپنی عبادتوں کے لحاظ سے بھی غیر شریک ہے۔ وہ نہ ۳۳ کروڑ صفات کے جلوؤں میں ۳۳ کروڑ ہے' اور نہ تین اقانیم میں منقسم ہو کر واحد ہے اور نہ وہ دو متضاد احوال کی بناء پر دو ہے بلکہ وہ ایک واحد' متفرد' منفرد اور غیر شریک ہے نہ کسی پیغمبر کو یہ قدرت ہے کہ وہ اس کی الوہیت میں ذرہ برابر شریک ہو سکے اور نہ کسی نمرود و فرعون یا کسریٰ و قیصر اور مہاراج کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس کی شہنشاہی اور ربوبیت میں شرکت کا دعویٰ کر کے انا ربکم الاعلی کی آواز کی بلند کر سکے۔

سب کا ایک خدا

لیکن توحید کی تکمیل ابھی ایک اور قدم کی محتاج تھی اور وہ یہ تعلیم تھی کہ وہ واحد منفرد جو ہمارا خدا ہے جس طرح وہ اپنی ذات و صفات و عبادات میں واحد منفرد ہے۔ اسی طرح اپنے تعلق کے لحاظ سے بھی منفرد ہے یعنی یہ کہ وہ ہی جو ہمارا ایک خدا ہے وہی ہر ذرہ سے لیکر آفتاب تک ہر ایک کا واحد خالق و مالک ہے۔ کیڑے مکوڑے پھول بوٹے' حیوان اور انسان سب اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تمام کائنات اسی ایک کے قبضہ

قدرت میں ہے پست وبلند نشیب و فراز اور فرش و عرش سب اسی ایک کے زیر فرمان ہیں۔

وحدت کی غلط تعبیریں

بہت سی قوموں نے اس کو ایسا مانا تھا کہ وہ انہیں کا ہے دوسروں کا نہیں۔ انہوں نے انسانوں کے اندر پستی وبلندی اور شرافت ورذالت کے درجے اور مرتبے قائم کر کے یہ یقین پیدا کر لیا تھا کہ وہ صرف بلند و شریف انسانوں کے طبقہ کا واحد خدا ہے اور بقیہ پست و ذلیل مخلوقات اس قابل نہیں کہ وہ اس سے تعلق کی نسبت رکھ سکیں۔ وہ گویا ایک خدا تھا۔ مگر صرف ایک خاندان یا کسی ایک قوم یا کسی ایک مذہب کا خدا دوسروں کا نہیں۔ چنانچہ سپید رنگ، شریف النسل آریہ اس کو صرف اپنے ہی لئے خاص سمجھتے تھے اور پھر وہ بھی ایرانی اور آریہ ورت کے رہنے والوں میں منقسم ہو کر اس طرح دو ہو گئے تھے کہ ان میں سے ہر ایک کو بجائے خود یہی دعویٰ تھا کہ خدا تعالیٰ کی بندگی کے صرف وہی اہل ہیں انتہا یہ کہ اگر ایک (آریہ) کے یہاں لفظ دیوتا الوہیت اور خدائی معنی دیتا ہے تو وہی لفظ دوسرے (ایرانی) کے یہاں بصورت دیو جن و شیطان کے معنی رکھتا ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے دو حصوں شمالی اور جنوبی میں شیو اور وشنو جو دونوں خالق و قیوم کے معنوں میں ایک ہی ذات پاک پر دلالت کرتے ہیں وہ ہندوؤں کے دو حصے کر دیتے ہیں، ایک شیو کو پوجنے والے اور دوسرے وشنو کے ماننے والے۔

پاک نژادان ایران کا اہور مزد اونکا خدا تھا مگر ہندو آریوں میں وہ سورج سے زیادہ نہیں، ہندو آریوں میں سے برہمنوں نے اپنا وہ خدا مانا جو صرف انہیں کا خدا تھا۔ جس نے اپنے منہ سے ان کو پیدا کیا اور دوسری ہندو قوموں کو اپنے بازوؤں اور ٹانگوں سے۔

ساميوں کا خدا صرف انہیں کا تھا بلکہ بنی اسرائیل کے نزدیک وہ خاص ان کے خاندان کا تھا خداوند میرے خاوند ابراہیم کا خدا۔ پید ۲۴۔ ۲۷

اے میرے باپ ابراہام کے خدا اور میرے باپ
اسحٰق کے خدا' پید ۳۲۔ ۹

میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہیم کا خدا اور اسحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔ خروج ۳۔ ۶

پھر خدا نے موسیٰ سے کہا کہ تو بنی اسرائیل سے یوں کہیو کہ خداوند تمہارے باپ کے خدا ابراہام کے خدا اور اسحاق کے خدا اور یعقوب کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ خروج ۳۔ ۱۵

میرے باپ کا خدا ابراہام کا معبود اسحاق کا مسجود
پید ۳۱۔ ۱۵

اور انہیں کہہ کہ خداوند تمہارے باپ کا خدا ابراہام اور اسحاق اور یعقوب کا خدا یوں کہتا ہوا مجھے دکھائی دیا ۱۶

خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تو میرے لوگوں کو جانے دے۔ خروج ۵۔ ۱

فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی آواز سنوں کہ بنی اسرائیل کو جانے دوں' میں خدواند کو نہیں جانتا'............ تب انہوں نے کہا کہ عبرانیوں کے خدا نے ہم سے ملاقات کی۔ ۱۷

اور اسے کہیو کہ خداوند عبرانیوں کے خدا نے میرے تئیں بھیجا ہے کہ اور کہتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے۔ ۱۶

وہ میرے باپ کا خدا ہے (خروج ۱۵۔ ۲)

اس طرز ادا کی وجہ یہ ہے کہ اس قدیم زمانے میں خدائے

برتر کی پرستش صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہی میں منحصر تھی یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی حضرت یعقوبؑ کے سوال پر ان کے بیٹوں کی زبان سے اسی قسم کے فقرے ادا کیے ہیں۔

نَعبُدُ اِلٰهكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبرَاهِيمَ وَاِسحَاقَ (بقرة)

ہم آپ کے خدا اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم اور اسحٰق کے خدا کی عبادت کریں گے

لیکن بنی اسرائیل نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ یہ خدا خاص انہیں کا خدا ہے جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی شریک نہیں اور وہ ان کا خاندانی خدا ہے۔

عیسائیوں کا خدا عیسائیوں کا باپ تھا، مگر اس باپ کے کنبہ میں ان کے سوا کوئی دوسرا شریک نہ تھا ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ والا خدا یہاں آکر صرف کواری ماں کے بیٹے کا باپ رہ گیا ہے جیسا کہ انجیل میں بار بار آیا میرا باپ جو آسمان میں ہے۔

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی تعلیم

یہ تھا اس خدائے واحد کا تخیل جو قوموں اور خاندانوں اور شخصیتوں کا خدا بن کر محدود سمجھ لیا گیا تھا اس کے بعد خاتم الانبیاء علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ آپ کی تعلیم نے جہاں وحدت ربانی کے دوسرے پہلوؤں کی تکمیل کی اس وحدت کے مفہوم کو بھی مکمل کیا اور بتایا کہ وہ ایک ہی خدا ہے جو برہما بھی ہے مہیش بھی، وشنو بھی ہے اور شیو بھی، یعنی خالق بھی ہے قیوم بھی زندہ کرنے والا بھی ہے اور مارنے والا بھی الذی یحییٰ ویمیت وہی مارتا اور جلاتا ہے وہ کالے گورے آریائی اور سامی، ایرانی اور تورانی، ہندی

اور عربی، اسرائیلی اور اسماعیلی، موسوی اور عیسوی ہندو اور مسلمان بلکہ زاہد شب زندہ دار اور فاسق گنہگار سب کا یکساں خدا ہے اور سب اس کے دربار کے یکساں بندے ہیں، برہمن ہو کہ شودر یہودی ہو کہ غلیتن مختون تثلیث پرست ہو کہ موحد آقا ہو غلام، اونچا ہو یا نیچا بندہ ہونے کی حیثیت سے سب اس کے سامنے ایک ہی درجہ رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان کے خدا کی طرف سے یہ حکم ہوتا ہے کہ تم دوسرے مذہب والوں سے کہہ دو اِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

سب اسی کے بندے ہیں اور وہی ایک سب کا خالق و مالک اور محی و ممیت ہے۔ یہاں کوئی محمد (صلعم) کا خاص خدا نہیں، قریش کا خدا نہیں، عرب کا خدا نہیں، مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ کل دنیا کا ایک خدا ہے ایک وحدت ربانی ہے جس میں کل بندگان الٰہی باہم یکساں شریک ہیں۔ وہ سب اس کے بندے ہیں اور وہ ایک ان سب کا خدا ہے قرآن کی سب سے پہلی سورۃ کی سب سے پہلی دعا اور اس دعا کا سب سے پہلا فقرہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو سکھایا یہ ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ساری خوبیاں اس ایک خدا کی ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ایک ہی ربوبیت ہے جس میں نہ صرف کل دنیا بلکہ کل دنیاؤں کی ساری مخلوقات یکساں شریک ہیں اور اس لحاظ سے محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے ان تمام تفرقوں کو مٹا دیا جو ایک خدا کے ماننے کے باوجود دنیا کی قوموں اور خاندانوں کو مختلف خداؤں میں تقسیم کر دیتے تھے اور بتا دیا کہ ہم سب کے سب ایک خدائے واحد کے بندے ہونے کی حیثیت سے باہم بھائی بھائی ہیں سید ہوں کہ شیخ، پرانے خاندانی مسلمان ہوں کہ نو مسلم برہمن ہوں کہ چمار، یورپین ہوں کہ ایشیائی سب ایک ہی آقا کے غلام اور باہم خواجہ تاش ہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ

سارے انسانوں کا پروردگار سب انسانوں کا بادشاہ اور سب انسانوں کا خدا۔

یہ وہ وحدت ربانی ہے جس کا جلوہ محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ ہم نے دیکھا اور وہ حقیقت ہے جس کو آپ کی تلقین سے ہم نے سمجھا یعنی یہ کہ وہ ایک ہی شہنشاہ مطلق اور رب العباد ہے جس کی ربوبیت میں تمام مخلوقات ارضی و سماوی، انسانی و حیوانی اور تمام دنیا کے خاندان اور نسلیں، قومیں اور ملتیں برابر کی شریک ہیں فرمایا۔

اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔

بیشک یہ تم سب کی امت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں تو تم سب میرا ادب لحاظ کرو

یہ وہ بلند تخیل ہے جس نے نہ صرف عرب و عجم، ترک و تاجیک، زنگ و فرنگ، ہندو سند، روم و تاتار، یورپ و ایشیاء سب کو ایک ربوبیت واحدہ اور ایک اخوت عامہ میں مربوط و منسلک کر دیا بلکہ انسانوں اور حیوانوں کو بھی ایک پروردگار کے سامنے سرنگوں کر کے انسانوں کو حیوانوں کی خدمت اور حیوانوں کو انسانوں کی خدمت کا سبق پڑھایا۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (انعام)۔

نہ تو کوئی زمین میں رینگنے والا جانور ہے اور نہ کوئی پرندہ ہے جو اپنے دو بازوؤں سے اڑتا ہے لیکن وہ تمہاری ہی طرح امت ہے۔

وحدت رسالت

وحدت الٰہی کے بعد وحدت رسالت ہے اور اس سلسلہ میں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو اصلاح ہوئی۔ جو غلط فہمیاں دور ہوئیں اور جو بلند تخیل منصب نبوت کے متعلق پیش فرمایا اس کو ذرا تفصیل سے سننے کی ضرورت ہے۔

تخصیص کا ابطال

سب سے بڑی غلطی جو دوسری قوموں سے اس مسئلہ کے متعلق سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ نبوت کو خاص خاص خاندانوں اور قوموں میں محدود اور مخصوص کر دیا گیا تھا آریہ ورت کے ہندو کہتے تھے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور مینوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اوراق میں محفوظ ہے زردشت والے ایرانیوں کے علاوہ سب کو یزدان کے جلوہ نورانی سے محروم خیال کرتے تھے۔ بنو اسرائیل اپنے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عیسائی صرف اپنے آپ کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اس تخصیص کو خدا کی شان رحمت اور عدل وانصاف کے منافی تصور کیا اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں اس کی تردید کی۔ ایک یہودی حضرت موسیٰ کے سوا سب پیغمبروں کا انکار کر سکتا ہے ایک عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مان کر عیسائی رہ سکتا ہے ایک ہندو تمام دنیا کو شودر کہہ کر بھی پکا ہندو ہو سکتا ہے ایک زردشتی حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی تکذیب کر کے بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن ایک مسلمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ جب تک تمام پیغمبروں کو تسلیم نہ کرے مسلمان نہیں ہو سکتا۔ تنگ خیالی کا دائرہ صرف یہیں تک محدود نہ تھا کہ نبوت کو ملک و قوم اور زبان کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ مخصوص کرنے والے خود پیغمبروں میں تفریق کرتے تھے۔ یعنی ان میں سے بعض کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے یہود حضرت عیسیٰ کو نعوذ باللہ کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے

تھے قریش حضرت عیسیٰ کے نام سے چلا نے لگتے تھے۔

فاذا قومك منه يصدّون' یہود و نصاریٰ حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کو صرف بادشاہ سمجھتے تھے اور پیغمبر نہیں مانتے تھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب و عجم' شام و ہند' یورپ' پچھم' اوتر' دکھن' کی تخصیص کو دور کرتے ہوئے بتایا کہ ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا گیا اور اس کی آواز سنی گئی ہے اس لئے بلا تفریق و امتیاز دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راستباز تسلیم کرنا چاہیے۔

مفہوم نبوت کی وضاحت

ایک اور واقعیت جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے' یہ ہے کہ اسلام سے پہلے نبوت و رسالت اور پیغمبری کی کوئی واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی' یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیش گوئی کے تھے اور نبی پیشگو کو کہتے تھے جس کے متعلق ان کو یہ یقین تھا کہ اس کی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی ہے چنانچہ تورات کے صحیفہ تکوین میں اس مضمون کی آئیتیں موجود ہیں' اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ' حضرت لوط' حضرت اسحٰق' حضرت یعقوب' اور حضرت یوسف کی نبوت و رسالت کا ایک دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے بلکہ بعض پیغمبروں کے مقابلہ میں بعض کاہنوں کی پیغمبرانہ شان زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی حیثیت صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیش گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں۔

یہود کی طرح نصاریٰ بھی خدا کے سب پیغمبروں کو یکساں تسلیم نہیں کرتے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول ہے کہ مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو

تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی کے نزدیک حضرت عیسیٰ سے پہلے کے پیغمبروں کی حیثیت کیا تھی۔ موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسول کی تعریف ہے نہ ان کے تذکرے ہیں نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی' حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کا بے شبہ تذکرہ کیاہے لیکن پیغمبرانہ شان کے ساتھ نہیں۔

اس تخیل کا یہ اثر تھا کہ یہود اور نصاریٰ دونوں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف بے تامل نہایت رکیک اور سخیف باتیں منسوب کرتے تھے مثلاً حضرت لوط پر بدکاری کا الزام لگاتے تھے حضرت سلیمان کو گنڈا تعویز' اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے حالانکہ سحر اور جادو کو تورات میں شرک قرار دیا جاچکا ہے عیسائی حضرت عیسیٰ کے علاوہ تمام پیغمبروں کو گنہگار خیال کرتے تھے بلکہ انجیل کے مختلف حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود اور خود عیسائی بھی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی نسبت بعض ایسی باتیں کہتے تھے جو ان کی شان عظمت کے سراسر منافی ہیں۔ مثلاً یہود حضرت مریم پر تہمت رکھتے تھے اور انجیل کے طرز سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے اور احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی۔ اس طرح موجودہ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نماز وروزہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

اسلام میں نبوت کا مفہوم

حضرت انبیاء کرام علیہ السلام پر یہود و نصاریٰ کے یہ الزامات صرف اس وجہ سے تھے کہ ان کے مذہب میں نبوت ورسالت کا کوئی بلند تخیل نہ تھا اور نہ انبیاء کی عظمت کی کوئی بلند سطح قائم تھی۔ لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں کی عظمت وجلالت کی ایک نہایت بلند سطح قائم کی اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عظمت تمام انبیاء و مرسلین کا مشترک وصف تھا سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ وہ

سب خدا کے بخشے ہوئے ایک خاص منصب پر سرفراز تھے' وہ سب دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ خدا کے احکام لوگوں کو سنائیں اور نیکی اور سچائی کا راستہ سب کو دکھائیں وہ سب رہنما ہوشیار کرنے والے خدا کی طرف بلانے والے' خوشخبری سنانے والے تعلیم دینے والے خدا کے احکام پہنچانے والے نور' روشنی خدا کے نیک اور مقبول بندے اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے۔

اسلام میں اگرچہ پیغمبروں کی تعداد معین نہیں ہے تاہم قرآن پاک میں ان کی دو قسمیں ہم کو بتلائی گئی ہیں۔ ایک وہ جن کے ناموں کی تصریح قرآن میں کی گئی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام قرآن میں مذکور نہیں' پہلی قسم میں بھی کئی تقسیمیں ہیں' بعض وہ انبیاء ہیں جن کو اہل عرب اور یہود و نصاریٰ سب جانتے تھے مثلاً حضرت ابراہیمؑ وغیرہ بعض وہ ہیں جن سے اہل عرب واقف تھے لیکن یہود و نصاریٰ کو ان کی خبر نہ تھی۔ مثلاً حضرت ہود اور حضرت شعیبؑ بعض ایسے ہیں جن کو یہود و نصاریٰ پیغمبر نہیں مانتے تھے لیکن دراصل وہ پیغمبر تھے' مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دوسری قسم میں ہر قوم و ملک کے وہ نیک لوگ داخل ہو سکتے ہیں جن کو ان کے ماننے والے پیغمبروں کا سا درجہ دیتے ہیں۔ جیسے یونان کے سقراط' ایران کے زردشت ہندوستان کے سری رام چندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما گوتم بدھ اور چین کے حکیم کنفوشیوس وغیرہ' بشرطیکہ ان کی سچی تعلیم میں توحید اور کلیات دین کے سبق موجود ہوں' لیکن چونکہ ہم یقینی طور پر ان ملکوں کے پیغمبروں کے ناموں کی تعین نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے پاس تخصیص و تعین کا ذریعہ صرف وحی محمدی ہے اور وہ ان کے ناموں کی نسبت خاموش ہے اس لئے ہر مسلمان کو پہلی قسم کے انبیاء کو نام بنام تفصیلاً اور دوسرے قسم کے پیغمبروں کو نام کی تخصیص کے بغیر ماننا ان کی صداقت کو تسلیم کرنا اور اس تسلیم کو ذریعہ نجات سمجھنا لازم ہے۔

ان تمام انبیاء کا دین ایک ہے' ان کی تعلیم ایک ہے وہ سب وصفِ عصمت' میں شریک ہیں وہ سب خدا کے راستباز بندے تھے ان سب کا ایک ہی مشن ہے اور ان سب کی زندگی کا ایک ہی طرز ہے اور ان سب کی نبوت کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک ہی دین کی تعلیم دیتے ہیں۔

قرآن پاک کی متعدد آیتیں ہیں جس میں وحدت رسالت کے اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا کے تمام انبیاء اور پیغمبروں کی یکساں تعظیم و تکریم کریں' اور ان سب کو برابر سمجھیں اور یہ عقیدہ سکھایا گیا ہے۔

لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ   ہم خدا کے فرستادوں میں کوئی فرق نہ کریں

اور یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں خدا کے رسول آئے اور اس کے احکام لوگوں کو سناتے رہے۔ کوئی قوم نہیں جس میں خدا کا فرستادہ نہ آیا اس کے لئے عرب و عجم' روم و شام' بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل ایرانی اور تورانی کی کوئی تخصیص نہیں۔ ان تمام قوموں میں خدا نے اپنے رسول بھیجے اور ہم ان سب کو خدا کا یکساں رسول سمجھیں اس امر کی اسی تعلیم کا اثر ہے کہ مسلمان یہودیوں کے پیغمبروں عیسائیوں کے رسولوں اور اجمالاً ایران کے نبیوں اور ہندوستان و چین کے ربانی مبلغوں کو صادق راست باز یقین کرتے ہیں۔ خواہ وہ ان کے ناموں کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔

وحدت کتاب

اس عنوان سے وحدتِ ادیان کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے جو اسلام کی وسیع اور بلند ذہنیت کو ضیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اسلام سے پیشتر دوسرے مذاہب نے اس جانب توجہ نہیں کی تھی یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے تھے عیسائی تورات کے احکام کو نہیں مانتے تھے لیکن اس

کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے تھے اور تورات کے علاوہ دنیا میں جو اور کتابیں مذہبی حیثیت سے مقدس مانی جاتی تھیں اور جن کا زمانہ انجیل سے پیشتر تھا ان کی عزت اور عظمت نہیں کرتے تھے' پارسی اوستا کے علاوہ اور کسی کتاب کو خدا کا کلام تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور ہندوستان کے برہمن ویدوں کے سوا خدائی الہام کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلعم نے جو رواداری اور بے تعصبی اور نقطہ نظر کی وسعت اس مسئلہ میں ظاہر فرمائی وہ اسلام بلکہ دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں ہے۔

اس تعلیم کے مطابق ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآن مجید کی طرح گزشتہ پیغمبروں کی کتابوں کو بھی صحیح سمجھے اور ان کو منجانب اللہ تسلیم کرے بما انزال الیك وما انزل من قبلك گویا قرآن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انبیائے قدیم کی کتابوں پر بھی ایمان لایا جائے اور قدیم کتابوں کی تصدیق نہ کرنے کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تصدیق نہیں کی گئی ہے جس طرح قرآن پر ایمان نہ لانا اسلام میں کفر ہے اس طرح اگلی آسمانی کتابوں کا نہ ماننا بھی اسلام کے نزدیک کفر ہے۔ یہ ادب یہ عزت یہ رواداری کیا اسلام کے باہر کہیں مل سکتی ہے۔

آسمانی کتابیں اگرچہ غیر محدود ہیں تاہم تخصیص کے ساتھ جن کتابوں کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں وہ چار ہیں۔ تورات یا صحف موسیٰ زبور' انجیل اور قرآن ان کے علاوہ ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا ذکر آیا ہے لیکن ان کے نام نہیں بتائے گئے ہیں۔ بعض آیتوں میں صرف اگلے صحیفوں یا اگلوں کی کتابوں کا حوالہ آیا ہے بعض آیتوں میں دوسری قسم کے پیغمبروں کی طرح کتابوں کا بھی اجمالی ذکر آیا ہے یعنی ان کے ناموں کی تصریح نہیں کی گئی ہے لیکن ہر حال ہر جگہ ان کی صداقتوں کو یکساں تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے قرآن مجید پر ایمان لانے والے مسلمان مجبور ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم سے پیشتر کی ان کتابوں کو جن کے نام قرآن نے بتائے ہیں تفصیلاً اور

جن کے نام نہیں بتائے گئے ہیں ناموں کی تخصیص کے بغیر اجمالاً خدا کی کتابیں سمجھیں اس لئے ایسی اگلی کتابوں کو جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں گو ان کا ذکر قرآن میں نہ ہو جھوٹا نہ کہیں کیونکہ ان کا بھی خدا کی کتاب ہونا ممکن ہے۔ گو قطیعت کے ساتھ ان کا فیصلہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ قرآن نے ان کے نام نہیں بتائے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہو گا کہ اسلام نے دنیا کے تمام مذاہب حقہ کو ایک ہی سمجھا ہے کیونکہ خدا جو ان تعلیمات کا سرچشمہ ہے ایک ہی ہے تمام رسول اور پیغمبر جو اس سرچشمہ سے سیراب ہیں مقصد کے لحاظ سے متحد ہیں یعنی سب کا مبداء ایک اور تعلیم ایک ہے اس لئے تمام کتابیں جو ان رسولوں کے ذریعہ سے دنیا کو دی گئیں اور جو احکام انہیں بتائے گئے وہ بھی یقیناً ایک تھے اس حقیقت کو کہ تمام رسولوں کی تعلیم ایک تھی قرآن مجید میں متعدد جگہ صاف صاف بیان کیا گیا ہے اس بناء پر اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلعم تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے سے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

وحدت دین

عام مذہب کا خیال ہے کہ جو مذاہب اس وقت پھیلے ہیں وہ ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ تمام سچے مذاہب در حقیقت ایک ہی ہیں ایک ہی پیغام ہے جو آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا مایقال لك الا ماقد قیل للرسل۔

اس مقام پر ایک نکتہ بیان کرنے کے قابل ہے' قرآن مجید نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کئے ہیں' دین اور شرعیۃ جس کو منسک اور منہاج بھی کہتے ہیں دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے' مثلاً خدا

کی ہستی' اس کی توحید' اس کے صفات کاملہ' انبیاء کی بعثت' خدا کی خالص عبادت' حقوق انسانی' اخلاق اچھے اور برے اعمال کی باز پرس جزاء وسزا یہ وہ اصل دین ہے جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی اسی کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاء آئے اس میں زمان ومکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں نہ قوم وملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی' اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہویا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں اور اس کی اصلی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

دوسری چیز یعنی شرعہ منہاج اور منسک وہ جزئیاتِ احکام ہیں جو ہر قوم ومذہب کی زمانی مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں مثلاً عبادت الٰہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے عبادت کی سمتیں الگ الگ ہیں' اعمال فاسدہ کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں۔

اب قرآن کے نقطہ نظر سے مذاہب کے اختلاف کا یہ مطلب ہے کہ اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے نا قابل تبدیل اور نا قابل تغیر ہے البتہ متفقہ حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے ہیں۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی قوم وملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیاء کا یکے بعد دیگرے ظہور اور اس کی وجہ

انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب

شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اس وقت بھیجا گیا ہے جب پہلا صحیفہ وحی کھو گیا ہے یا ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے حضرت ابراہیم کے صحیفوں کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ پر تورات نازل ہوئی اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور و غیرہ مختلف صحیفے آتے رہے جو عہد نامہ قدیم میں موجود ہیں پھر اس کی تکمیل کے لئے انجیل آئی اور جب اس میں بھی انسانی تصرفات کا دخل ہو گیا تو قرآن اترا۔

آخری کتاب

مگر قرآن اس دعویٰ کے ساتھ اترا ہے کہ اب اس کے بعد کسی دوسری آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے تحریف و تبدیل سے محفوظ کر دی گئی ہے اور اس کی حفاظت کا وعدہ خود خدا نے کیا ہے اور یہ وہ وعدہ ہے جو دنیا کی کسی آسمانی کتاب کے لئے خدا نے نہیں فرمایا تھا اس سے معلوم ہوا وہ دنیا کی آخری کتاب اور اس کا رسول دنیا کا آخری پیغمبر ہے اب جو کچھ فیض دنیا کو پہنچے گا اسی کے ذریعے پہنچے گا۔

ہندوستان میں روشنی وحدت و بازگشت

چنانچہ صرف ایک ملک ہندوستان پر غور کیجئے۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد ہندوؤں میں بہت سے ایسے مصلح پیدا ہوئے جنہوں نے بت پرستی کے خلاف توحید کا وعظ کہا اور لوگوں کو اس دین کی دعوت دی' چودہویں صدی عیسوی میں رامانند۔ سنیاسی نے اصول توحید پر ایک نئی جماعت قائم کی جس کا خیال یہ تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہے' پندرہویں صدی میں کبیر نے ہندوؤں کی بت پرستی اور دھرم شاستری کا خاکہ اڑایا اور مسلمانوں کو ان توہمات سے آگاہ کیا جن میں وہ مذہب کے نام سے گرفتار ہو گئے تھے اس طرح ہندو اور مسلمان کے مذہبی تفریقات کو بالائے طاق رکھنا کبیر کا خاص مقصد

معلوم ہوتا ہے جو اسلام کی تعلیم کا مقصد اولین تھا' سکھ مذہب کی ابتداء بھی اسلامی اثر کے ماتحت معلوم ہوتی ہے اور اب بھی جہاں کہیں سے یہ آواز آرہی ہے وہ اسلام ہی کی صدائے بازگشت ہے۔

اسلام کی دعوت اتحاد کا صحیح مفہوم

ان تاریخی حقائق سے واضح ہوا ہوگا کہ اسلام نے وحدت دین کا جو تخیل پیش کیا ہے وہ قدیم زمانہ سے لے کر آج تک مختلف ملکوں میں کس طرح پیدا ہوتا رہا ہے اور دنیا میں جو راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک پر کھولا گیا' اس کی عملی شکلیں آپ کے بعد کہاں کہاں اور کیونکر ظاہر ہوئیں اسی بنا پر قرآن مجید کا وہ دعویٰ کس قدر صحیح اور واقعیت سے لبریز ہے جو اہل کتاب کے سامنے کیا گیا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں ورنہ ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہمارے تمہارے درمیان جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا تو جب تھا جب اصول میں اختلاف ہوتا اصول کو تو سب تسلیم کرتے ہیں البتہ فروع میں اختلاف ہے اور فروعی اختلافات کوئی اختلاف نہیں' یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ بندیوں سے دین میں تفریق پیدا کر دی تھی قرآن نے ان کو اصل دین یعنی "دین قیم" کی طرف بلایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ "تم سے وہی کہا گیا ہے جو تم سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تمہارا دین وہی ہے جو حضرت نوح اور حضرت ابراہیم وغیرہ کا تھا ساتھ ہی اس وحدت دین کا دوسرا رخ بھی اسی طرح سامنے رکھا گیا کہ جزئیات کے اختلاف کو چنداں اہمیت نہیں دی گئی۔

چنانچہ قبلہ وغیرہ کے تعین کے سلسلے میں اس حقیقت کو صاف طور

سے واضح کیا گیا۔ حالانکہ یہی چیزیں تھیں جن کی بناء پر یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو برسر باطل کہا کرتے تھے۔ قرآن نے اصل مقصد کے مقابلہ میں ان چیزوں کو نظر انداز کیا۔

عقیدہ وحدت دین اور سیاسی اتحاد

وحدت دین کی تعلیم کا ایک عملی اثر بھی تھا جو اور مذاہب میں نظر نہیں آیا۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس کو مذہب کے حدود سے باہر حکومت کے قوانین اور احکام میں تلاش کرنا چاہیے۔ یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں تھیں بنو اسرائیل اور غیر بنو اسرائیل اور انہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کے بنیاد تھی۔ عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست تین قومیں تسلیم کی جاتی تھیں لیکن چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں ہے اس لئے وہ اکثر امور میں رومن لا کے ماتحت رہے لیکن رومن عیسائیوں میں بھی دو ہی تقسیمیں تھیں رومی اور غیر رومی۔ پارسیوں میں ایرانی اور غیر ایرانیوں کی تفریق تھی ہندو اونچ نیچ ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔

لیکن اسلام نے وحدت دین کے تخیل کی بنا پر قانون کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے۔ جن پر برابر تیرہ صدیوں میں عمل ہوتا رہا۔ مسلمان ' اہل کتاب شبہ اہل کتاب ' کفار اور مشرکین ان قوانین کی وجہ سے دنیا میں امن وامان اور مسلمانوں میں رواداری پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے مذہبی عقائد پر سختی سے پابند رہنے کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ میل جول پیدا کریں اور ''تعاون عمل'' کیلئے تیار ہوں

مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ ملکر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی قوت پیدا کرنا اسی عقیدہ کا کرشمہ تھا۔

وحدت انسانیت

توحید کی تکمیل کے سلسلہ میں دو چیزیں ابتداء اور انتہا مانی جاسکتی ہیں ابتدا خدا کی حقیقی عظمت سے ہوتی ہے۔ اور انتہا انسان کے اصلی مرتبہ پر مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، بتوں کو سجدہ کر کے پتھروں کو پوج کے، درختوں کے آگے جھک کے، جانوروں کو دیوتا جان کے جنات اور خبیث روحوں کی دہائی پکار کے آسمانی مخلوقات کو ارباب جان کے، انسان کو خدا کہہ کے حقیقت میں اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ انہوں نے انسان کے رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا دراصل انسان کو پتھروں سے، جانوروں سے درختوں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لئے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں، چاند، سورج، دریا، جانور، آگ غرض فطرت کے تمام مظاہر سورج سے لے کر زمین کے رینگنے والے کیڑوں تک سب ان کے آقا ہیں اور وہ ان کی غلامی کے لئے پیدا ہوئے ہیں، انسانی برادری بھی دیوتاؤں کی حکومت کی وجہ سے اونچی نیچی بلند و پست، شریف ورذیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم ہو گئی تھی کوئی پرمیشور کے منہ سے کوئی ہاتھ سے اور کوئی پاؤں سے پیدا ہوا تھا اس لئے سب کے درجے برابر نہ تھے مساوات انسانی کا نام نہ تھا، مختلف جنسیں تھیں جن کا متحد ہونا ناممکن ہو گیا تھا، بابل، مصر، ہندوستان اور ایران کے حیاء و متمرد شاہنشاہ اپنے بنی نوع سے اس قدر اونچے ہو گئے تھے۔ کہ ان کا عزل و نصب انسان کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں تھا بلکہ وہ خود دیوتا اور ربِ اعلیٰ ہونے کے مدعی تھے۔

مرتبہ انسان کا اعلان

محمد رسول اللہ صلعم نے آکر خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ دنیا کے تمام پست وبلند اور نشیب و فراز کو برابر کیا۔ قوموں اور ذاتوں کا امتیاز اٹھادیا دولت 'فقر' رنگ وروپ 'نسل' قومیت کے نشانات مٹ گئے اور فخر و غرور اور جبر و ظلم کا بازار سرد پڑ گیا سب انسان خدا کے بندے' سب اس کے سامنے برابر' سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔

محمد رسول اللہ صلعم نے ہم کو بتایا کہ رات' دن' آفتاب' ماہتاب ستارے' جانور' دریا' آگ' درخت غرض کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور وہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو اپنے خدمت گزاروں میں سے کسی کو اپنا معبود بنائے۔

انھوں نے اپنی وحی کے ذریعے سے دنیا کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے وہ خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے! کروڑوں مخلوقات الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی ہوا' یہ منصب نہ فرشتوں کو ملا' نہ آسمانوں کو' نہ زمینوں کو' اور نہ پہاڑوں کو' قرآن مجید نے کہا کہ انسان بزرگیوں سے سرفراز' عالم مخلوقات میں سب سے برتر اور انعام واکرام سے معزز ہے اس میں بر و بحر پر چھا جانے کی قوت ہے اس کی ہستی' معتدل قویٰ اور بہترین اندازے کے ساتھ مخلوق ہوئی ہے وہ کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے تو اب وہ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے؟

غرض محمد رسول اللہ کی تعلیم نے انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھا کر صرف ایک خدا کے آستانہ پر جھکا دیا اور بتا دیا کہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے کام میں لگی ہوئی ہیں اور اسی کے لئے بنی ہیں اب بتاؤ کہ وہ زمین کی کس ہستی کے سامنے اپنا سر جھکائے؟

دنیا نے انانیت کی اس بلند سطح، حقیقت شناسی کے اس اعلیٰ تخیل اور ادائے فرض کے اس قوی احساس تک جو ترقی کے قدم اٹھائے ہیں ان کا مبداء اور دیباچہ بھی قرآنی تعلیمات تھیں۔ جنھوں نے انسان کی حقیقت اس پر آشکار کر کے اس کو خود شناس بنایا۔ ادائے فرض کی صورتیں سمجھائیں، افراد و اقوام کی شیرازہ بندی کی اور ان کو ایک سطح پر لا کر یکرنگی کا لطف پیدا کیا، یہی چیز تھی جس سے بکری اور اونٹ چرانے والے انسان، عالم کے گلہ بان بن گئے۔ ریت کے ذروں سے کھیلنے والے بدوی سیم و زر اور تخت و تاج پر بازی لگانے لگے، صحرا کی پشت پر لیٹنے والی قومیں کیوان کی چھت پر مسہریاں بچھاتی تھیں اور چند نخلستانوں کے مالکوں کا نعرہ چار دانگِ عالم کو سِ لمن الملک بجاتا تھا۔

ہر قسم کی تفریقات کا ابطال

انسانوں نے فخر و غرور سے اپنی ایک متحدہ انسانیت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ بادشاہوں نے خدائی کا مرتبہ پایا تھا اور ان کو سجدے کئے جاتے تھے اور ان کے احکام خدائی فرامین کی صورت رکھتے تھے بابل کے نمرود اور مصر کے فرعون جو اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا نعرہ لگاتے تھے۔

محمد رسول اللہ ہی کی آواز تھی جس نے ان کو ان کے تخت جبروت سے اتار کر عام انسانوں کے درجہ میں لا کر بٹھایا اور خدا کے سوا کسی کو شہنشاہ اور بادشاہ کہنا بھی ناپسندیدہ قرار دیا۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح اہل مذاہب نے رسولوں، ولیوں اور شہیدوں کو خدائی اور الوہیت تک پہنچا دیا تھا محمد رسول اللہ صلعم نے ان میں سے ہر ایک کو بندگی اور عبودیت ہی کے مختلف مدارج اور مراتب پر متعین کیا اور سب کو یکساں خدا کا بندہ اور فرمانبردار قرار دیا۔

قوموں نے بھی اپنے لئے الگ الگ رتبے اور درجے قائم کر لئے تھے بنی اسرائیل اپنے کو خدا کا کنبہ کہتے تھے، ہندوؤں میں برہمن خدا کے مُنہ سے راجپوت اس

کے بازوؤں سے' شودر اس کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے تھے۔ روم میں رومنس خاص بادشاہی کے لئے اور تمام غیر رومن صرف غلامی اور خدمت گاری کے لئے تھے اس طرح قوموں میں پستی وبلندی' عزت وذلت پاکی وناپاکی کی وہ امتیازی دیواریں قائم تھیں جنھوں نے ایک انسانیت کو سینکڑوں انسانیتیوں میں منقسم کر دیا تھا وہ محمد رسول اللہ صلعم ہی کی آواز تھی۔ جس نے امتیازی تفریق کی ان مدعی قوموں کو سب سے پہلے یہ خطاب کیا۔

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌمِمَّنْ خَلَقَ — تم بھی خدا کی دوسری مخلوقات میں سے انسان ہو۔

اور تمام امتیازات کی دیواروں کو دفعتاً منہدم کر کے سب کو انسانیت کی ایک سطح پر لا کھڑا کر دیا۔ فرمایا۔

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَا کُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ

اے انسانوں! ہم نے تم کو خاندان اور قبیلے بنا کر اس لئے پیدا کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو بیشک خدا کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے

قومیت خاندان' اور پیدائشی بزرگی اور بڑائی کے تمام امتیازات کا آج خاتمہ ہو گیا اور ہندو' برہمن' یہودی' لادیوں اور عیسائی پوپوں کو اسی طرح سطح وجود سے مٹا دیا گیا جس طرح دوسری طرف نمرودوں' فرعونوں' قارونوں اور ہامانوں کو مٹا دیا تھا۔

ایک آدم سے تمام انسانی قوموں کا پیدا ہو کر پھیلنا اسلام سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں میں محض آغاز پیدائش (کسموگریفی) کے ایک نظریہ کی حیثیت رکھتا تھا آنحضرت صلعم نے اس کو اخلاقی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیکر اس پر انسانی وحدت کی وہ عظیم الشان عمارت کھڑی کی جو انشاء اللہ اب کبھی منہدم نہ ہو گی۔ مغرور عربوں کے سب سے بڑے مجمع میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا۔

ان اللّٰہ اذھب منکم عصبیة الجاھلیة وفخر کم بالا باء کلکم بنو آدم وآدم من تراب

اللہ نے جاہلیت کا غرور اور باپوں پر فخر کا دعویٰ باطل کر دیا تم سب ایک آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے تھا۔

عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر جو امتیاز کا دعویٰ تھا۔ آج وہ باطل ہو گیا اور اعلان ہوا۔

لَافَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ لَافَضْلَ لِاَحْمَرَعَلٰی اَسْوَدَوَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ

عرب کو عجم پر فضیلت نہیں اور نہ عجم کو عرب پر۔
نہ گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر۔

غرض یہ وہ تعلیم تھی جس نے تمام انسانوں کو ایک کر دیا۔ عرب ہوں کہ عجم، فرنگ ہوں کہ زنگ، ہندو ہوں کہ چینی سب انسانی اخوت کی ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑے ہو گئے۔ توحید اور عموم رسالت کے اقرار پر کل دنیا کے انسان باہم بھائی بھائی قرار پائے تقویٰ کے سوا ہر پیدائشی اور فرضی امتیاز باطل ہو گیا اور دنیا کو یہ ندا دی گئی۔

لَاتَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَا غَضُوْا وَ کُوْنُوْایَاعِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا

ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے کینہ رکھو اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

ان عظیم الشان غلطیوں میں سے جن میں لوگ ہمیشہ سے مبتلا تھے ایک یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ دین اور دنیا دو مختلف چیزیں ہیں دونوں کا دائرہ الگ الگ ہے جو

دین کو اختیار کرتا ہے وہ دنیا سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور جو دنیا اور خارف دنیا پر نظر ڈالتا ہے اس کے ہاتھ سے دین کا دامن چھوٹ جاتا ہے اس خیال نے اگرچہ ایران' ہندوستان' چین اور دیگر ممالک مشرقیہ میں عملی شکل اختیار کر لی تھی اور راہباں صومعہ نشین وبادشاہان لشکر شکن کے حدود زندگی اور دائرہ عمل میں ایسی حد فاصل قائم کر دی تھی کہ دونوں کا اجتماع و تعاون تقریباً ناممکن ہو گیا تھا تاہم اس سلسلہ میں زیادہ قابل توجہ وہ قومیں تھیں جو اپنے کو صحائف آسمانی کا پیرو اور سفیران الٰہی کا مخاطب اول سمجھتی تھیں۔ ہندو' بدھ' کنفوشی اور زرتشتی نقطہ ہائے نظر سے زیادہ قابل غور وہ تخیل تھا جس میں انسانوں کی تقسیمیں کر دی گئی تھیں کہ ان میں کچھ دین کے کارکن تھے اور کچھ دنیا کے ہندوؤں میں خلقتہً برہمن دین کے لئے' راجپوت بادشاہی کے لئے دیش بیوپار اور کاشت کاری کے لئے اور شودر محنت و مزدوری کے لئے تھے اور ان کی عمروں کی بھی تقسیمیں کر دی گئی تھیں کہ تیس برس تعلیم کے اور تیس برس کمانے کے اور تیس برس عبادت کے۔ بودھوں میں بھکشو الگ کر دیئے گئے تھے جن کا کام صرف دھرم سیوا تھا اور دنیا دار الگ تھے جو دنیا کا کاروبار کرتے تھے اور جن پر بھکشوؤں کے تمام اخراجات کا بار تھا۔

یہودیوں میں لاوی دین کے کاہن تھے وہ دنیا کے کاموں سے الگ رکھے گئے تھے وہ خاندانی ترکہ و وراثت سے بھی محروم تھے کہ یہ دنیا کی چیزیں تھیں اور باقی لوگ دنیادار تھے۔ عیسائیوں نے اس امتیاز اور تفریق کی دیوار کو اور زیادہ بلند کر دیا تھا انہوں نے تو خدا اور قیصر اپنے دو حکمراں فرض کئے تھے اور یہ تعلیم پائی تھی کہ جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔

یہود و نصاریٰ نے اس غلط خیال کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی جس طرح کوشش کی اس کی عملی شکل دو متضاد طریقوں سے ظاہر ہوئی یعنی یہود نے عقبیٰ کا

حاصل دنیا کو سمجھا اور نصاریٰ نے عقبیٰ کو، یہود کی حکومت و سلطنت مال و دولت اور تمام سودی کاروبار کا مبنیٰ صرف یہ خیال تھا کہ انسان کے اعمال و افعال کا مرجع دنیا ہے اس لئے انہوں نے دین کو بالائے طاق رکھ کر اپنی توجہ تمام تر دنیاوی چیزوں تک محدود رکھی۔ اور ہر نیکی کا معاوضہ اسی دنیا کی نعمت کو سمجھا اور اسی لئے ان میں ایک بڑا فرقہ وہ تھا جو صرف دنیاوی انعامات پر اعتقاد رکھتا تھا اور آخرت کا قطعاً منکر تھا بخلاف اس کے اگلے نصاریٰ نے زرخاف دنیوی کو ہاتھ نہیں لگایا وہ ہر نعمت کو آسمانی بادشاہت میں تلاش کرتے رہے اس نے راہبانہ طریقہ زندگی اور زاہدانہ طرز معیشت اختیار کیا۔

اسلام کی تعلیم

لیکن پیغمبر اسلام علیہ السلام کے ذریعہ سے جب اسلام آیا تو اس نے دنیا کی اس قدیم غلط فہمی کو دور کیا اور بتایا کہ یہ دونوں چیزیں دو نہیں بلکہ ایک ہیں۔ دین دنیا ہے اور دنیا دین ہے دین میں جب خواہشات نفسانی شامل ہوں تو دنیا ہو جاتا ہے اور دنیا میں احکام الٰہی کا تتبع پیش نظر ہو۔ تو دین ہو جاتی ہے اس طرح جو چیز ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرتی ہے۔ وہ انسان کا نقطہ نظر ہے اگر وہ صحیح ہو تو پھر یہ حد بھی قائم کرتی ہے اور دونوں چیزیں ایک ہو جاتی ہیں وہی حکومت و سلطنت جس کو دنیا سمجھا جاتا ہے اگر وہ خدا کی مرضی کے لئے کی جائے تو دین ہو جاتی ہے۔ مال و دولت جمع کرنا دنیا ہے لیکن اگر احکام الٰہی کے تحت ہیں اس سے حق والوں کی خدمت پیش نظر ہو تو دین ہو جاتا ہے۔ خودکشی دنیا ہے لیکن اگر احکام خداوندی کی تعمیل میں کوئی اپنی جان فدا کرے تو شہادت کی شکل پا کر دین ہو جاتی ہے۔

پیغمبر اسلام فداہ ابی و امی نے عملی شکل میں ہم کو یہ صورت بتلائی۔ آپ کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قیام لیل، عبادت شبانہ۔ تلاوت قرآن، تبلیغ احکام، غزوات، و فتوحات، مہمات سلطنت کی مصروفیت غرض آپ کی سیرت کا ایک ایک واقعہ دین بھی

تھااور دنیا بھی عین اسی وقت جب آپ پر سکندر و قیصر ہونے کا دھوکا ہوتا تھا آپ سفیر الٰہی اور فرشتہ یزدانی نظر آتے تھے آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور صحابہ رضوان اللہ علیہم نے بھی اس نکتہ کو واضح کیا اور ان کے تمام زریں کارناموں کے اندر وہی روح نظر آئی جو دین اور دنیا کی ترکیب وامتزاج سے پیدا ہوئی تھی اور جو قرآن پاک کے منشاء کے عین مطابق تھی قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں انسانی اعمال کی جزا کو دنیا اور دین دونوں سے متعلق فرمایا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ انسان کو نیکی یا بدی کا پھل دنیا میں بھی ملتا ہے اور عقبیٰ میں بھی ملے گا یہ نکتہ صحابہ کرام کے بعد عرصہ تک مسلمانوں کے پیش نظر رہا۔ اور جب تک وہ اس کو سمجھتے رہے ان کے تمام اعمال وافعال میں تکمیلی رنگ نمایاں رہا۔ ان کی دنیا عین دین رہی اور دین عین دنیا۔

مسلمانوں کے زوال کا حقیقی سبب

لیکن جب اس سے نقطہ نظر میں تبدیلی واقعہ ہوئی ان کے کام ابتر ہو گئے اور ان میں اسلام کے بجائے یہودیت اور نصرانیت کا رنگ جھلکنے لگا ان میں اہل کتاب کی طرح دین اور دنیا دو مستقل اور جداگانہ چیزیں قرار پائیں بعض اعلانیہ دنیا کو اختیار کر کے دین سے غافل ہو گئے اور یہود کے خیال کو زندہ کر دیا۔ بعض نے ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی کو ترجیح دی اور عیسائیوں کی راہبانہ زندگی کی یاد تازہ کر دی اس کی ایک محسوس اور بین مثال خلافت کے حدود میں ملتی ہے پہلے خیال کے تسلط کے زمانہ میں خلیفہ دینی مقتداء اور دنیاوی سردار کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا لیکن جب دوسرا خیال مستولی ہوا تو ملوکیت اور پاپائیت کی صورت پیدا ہو گئی یعنی مذہبی پیشوا الگ ہو گئے اور دنیاوی حکومت سلاطین کے قبضہ واقتدار میں چلی گئی۔ اس تفریق نے مسلمانوں کی قومی قوت کو اور اجتماعی شیرازہ کو جس طرح توڑا اور منتشر کیا اس کے شواہد تاریخی دفتر سے باہر ان کی موجودہ حالت کے اندر آج بھی ملتے ہیں جن کو ماہروں کے فلسفے تاریخ

کے علاوہ امراض قوی کا ہر نبض شناس آج بھی سمجھ سکتا ہے اور جب کہ ہم اپنی موجودہ ابتری اور پستی کا احساس کر کے اس مرکزی خیال کی طرف عود کریں جو ہماری ترقی' سر سبزی اور تفوق کا ضامن تھا جس کے اندر اسلام کی روح جلوہ گر تھی اور جو یہودیت و عیسائیت سے بالکل علیحدہ تھا۔

آج مسلمان قومیں یا تو یہودی تخیل کا شکار ہیں اور یا عیسوی تخیل کا۔ محمدی دعوت آج اکثر ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے آج ممبر اور تخت دو سمجھے جاتے ہیں اور سپہ سالار اور امام نماز دو گروہ ٹھہرائے جاتے ہیں حالانکہ ہمارا منبر اور تخت ایک تھا اور ہمارے سپہ سالار ہی ہماری نماز کے امام ہوتے تھے۔

اسلام کی طرف آؤ

مسلمانوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو ایک مدت سے فراموش کر دیا ہے انہوں نے بھی دین و دنیا کے حدود مقرر کر لئے ہیں اور خدا اور قیصر دو شہنشاہوں کی رعایا بن گئے ہیں وہ سلطنت و حکومت اور تجارت و کسب زر اور تعلیم ہنر کو دنیا کا کام اور صرف نماز و روزہ اور تسبیح و وظیفہ خوانی کو دین کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ حسن نیت ہو تو ہر دنیاوی جدوجہد' ہر سیاسی سعی و فکر' ہر تعلیمی عمل و خدمت ہر تجارتی شغل و کاروبار' ہر صنعتی ترقی و اقدام اور ہر ایجاد و اختراع سراسر دین ہے اور حسن نیت نہ ہو تو رات بھر کی نماز اور دن بھر کا روزہ دین نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مذہب کو پیش کیا ہے اس میں دین و دنیا کی تفریق اگر کسی معنی میں ہے بھی تو کاموں کے امتیاز کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دلوں کی نیتوں کے فرق کی وجہ سے ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس کی بناء پر اسلام جب دین بن کر آیا تو ساتھ ہی ساتھ سلطنت و حکومت کا پیام بھی لایا۔ بودھ مذہب میں دین الگ سے آیا اور دنیا الگ سے بنی اسرائیل کو دین ملنے سے چار برس کے بعد سلطنت ملی' عیسائیت کو حضرت عیسیٰ کے صدیوں کے بعد تخت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جس وقت مدینہ منورہ میں اپنے دین کا ممبر نصب فرمایا اسی وقت دنیا کا تخت بھی بچھ گیا اور اسی وقت عظیم الشان وروحانی وتجارتی وسیاسی، علمی وتعلیمی غرض تمدن وتہذیب کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو گئے تیس برس کے اندر اندر خلیج فارس سے لے کر بحر ظلمات تک دین واخلاق، علم وعمل، عدل وانصاف اخوت ومساوات اور تہذیب وتمدن کی ایک نئی دنیا پیدا ہو گئی۔ اہلِ اسلام اور اہلِ کتاب کی مشترکہ ومتحدہ قومیت نے انسانی اخوت کی ایسی نظیر پیش کی جس کی مثال دنیا نے نہیں دیکھی تھی اور عرب وعجم، ترک وچین، ہندوروم اور بربرو حبش نے مل کر کے علم اتحاد کے زیر سایہ ایسی اخوت عامہ کی بنیاد ڈال دی جس کے مناظر اس دور ترقی میں بھی نظر نہیں آسکتے۔

اس تھوڑی سی مدت میں انقلاب کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ دین ودنیا کے کاموں کی تفریق کی دیوار اس نے ڈھادی تھی رہبانیت اور گوشہ نشینی کا کام اس نے عبادت نہیں رکھا تھا بلکہ ملکوں کے فتوحات ہوں مدرسوں کی تاسیس ہو تجارت کے بری وبحری سفر ہوں جنگی مشاغل ہوں یا امن وصلح کی کوششیں ہوں حصول رزق اور کسب دولت کی صحیح مساعی ہوں یا غریبوں، بیکسوں اور مسافروں کی امداد کے کام ہوں، آل واولاد اور زن وفرزند کی مخلصانہ خواہش یا خدا کیلئے تن تنہا جدوجہد اور جہاد ہو ان میں سے ہر کام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں دین تھا اس لئے ایک مسلمان کی زندگی کا ہر شعبہ ہر سعی ومحنت اور جدوجہد جو خدا کی مرضی کے حصول کی خاطر ہو سراسر دین ہے۔

مسلمانوں کی گزشتہ تباہی وبربادی کا اصلی سبب یہی ہوا کہ انہوں نے دین ودنیا کی اس وحدت کے نکتہ کو فراموش کر دیا۔ بادشاہ دنیاوی کاروبار کا اور شیخ الاسلام دینی معاملات کا ذمہ دار رہا اور عیسائیوں کی طرح دین الگ اور دنیا الگ قیصر الگ اور خدا الگ قرار دیا گیا ہے دینی کاموں کی فہرست الگ بنالی گئی اور دنیاوی کاموں کی فہرست الگ تیار کی گئی کچھ لوگوں نے اپنے کو خانقاہوں مسجدوں اور حجروں میں بند کر کے اپنے کو دین کا خادم کہلایا اور کچھ لوگوں نے دنیا کے بازاروں اور جدوجہد کی صفوں میں پہنچ کر

اُپنے کو دنیادار قرار دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل دین ہونے کے مدعی دنیا کے کاموں کے لائق نہ رہے اور کھلم کھلا اہل دنیا کہلانے والے خدا کے خوف وحیثیت کو بھلا اور اس کی رضا کی دولت کو کھو بیٹھے۔

اب امت محمدیہ علیٰ صاحبھا الصلواۃ پر فرض ہے کہ وہ دین ودنیا کی وحدت کے اس راز کو سمجھے اور اپنی نجات وفلاح کی تدبیر تلاش کرے۔

ایمان

جماعتوں کی تنظیم

کسی ذہنی اساس ملت اور بنیادی عمل سے ہوتی ہے

دنیا کی وہ تمام عظیم الشان قومیں جنہوں نے دنیا میں کوئی بڑا کام کیا ہے یا جو دنیا میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتی ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے پورے نظام ہستی کو کسی ایک قانون پر مبنی کریں، اور اپنی تمام منتشر قوتوں کو کسی ایک اصول کے تحت مجتمع کریں۔ زندگی کے سینکڑوں شعبے اور بقائے ہستی اور ترقی کے ہزارہا شاخ در شاخ اعمال جو دیکھنے میں تمام تر منتشر، پراگندہ، متفرق اور ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں، ان سب کے درمیان ایک واحد نظام، ایک متحدہ اصول، ایک مشترکہ جامعیت پیدا کریں، جن کا شیرازہ ان متفرق و پراگندہ اوراق کو ایک منظم کتاب بنادے۔

دنیا جب سے بنی ہے، تب سے آج تک ہزارہا قومیں پیدا ہوئیں اور مری ہیں لیکن کسی قوم نے اس وقت تک ترقی نہیں کی ہے جب تک اس کے اندر اس کی زندگی کا کوئی واحد نظام نہیں پیدا ہوا ہے، اور کسی واحد متخیلہ نے ان کے اندر یہ اہمیت نہیں پیدا کرلی ہے کہ وہ اس کے تمام افراد کی زندگی کی غرض وغایت، اور اس کے تمام اعمال کا مرکز و مرجع اور جہت و قبلہ نہ بن گیا ہو، وہی واحد متخیلہ بڑھ کر واحد جماعت، اور

اس سے بھی زیادہ پھیل کر ایک واحد ملت کی تخلیق و تکوین کرنا ہے۔

ہم اس کو ایک مثال میں سمجھانا چاہتے ہیں' روم کی سلطنت کا آغاز ایک گاؤں سے ہوا' اور رفتہ رفتہ یہ نقطہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ صدیوں میں ایک عظیم الشان سلطنت بن گئی۔ اس دائرہ کا نقطہ خیال' مرکز اتحاد' جہتِ اشتراک' اساس جامعیت' رومیت قرار پائی' جس نے رومیت کے اصول کو تسلیم کیا' اس کو شہرِ روم کے باشندوں کے حقوق عطا ہوئے۔ اور جس نے قبول نہ کیا' یا جس کو یہ شرف خود رومیوں نے عطا نہیں کیا' وہ ان حقوق سے محروم رہا' صدیوں تک یہ رومیت' رومی قوم کی زندگی کا شعلہ' حیات رہی' اور اسی کی روشنی میں پورا رومن امپائر اسپین سے لیکر شام تک جگمگاتا رہا' مگر جیسے جیسے یہ روشنی ماند پڑتی گئی اندھیرا چھاتا گیا اور جیسے جیسے یہ رومی عمارت کی یہ مستحکم بنیاد کمزور پڑتی گئی' ڈھتی گئی' یہاں تک کہ ایک دن یہ عمارت گر کر زمین کے برابر ہو گئی۔

الغرض قوموں کی موت وحیات کسی ایک "متخیلہ" کی موت وحیات پر موقوف ہے۔ جس کی زندگی سے ان کی زندگی' اور جس کی موت سے ان کی موت ہے۔ گذشتہ جنگ میں اور اس جنگ میں بھی آپ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ انگریز' جرمن' یا جرمن' انگریز سے لڑ رہے ہیں۔ نہیں' انگریزیت جرمنیت سے' یا جرمنیت انگریزیت سے لڑ رہی تھی اور لڑ رہی ہے' قوم' قوم سے نہیں لڑ رہی ہے' بلکہ ایک یقینی تخیل دوسرے یقینی تخیل سے لڑتا ہے۔

قوم کی زندگی کا وہ یقینی تخیل' اس کے تمام کاموں کی اساس و بنیاد بن جاتا ہے۔ پوری قوم اور قوم کے تمام افراد اس ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں' وہ نقطہ ماسکہ ان کی پوری زندگی کا محور بن جاتا ہے۔ اسی ایک تخیل کا رشتہ منتشر افراد کو بھائی بھائی بنا کر ایک قوم کے مشترکہ افراد ترتیب دیتا ہے۔ اور ایک واحد' متحد' منظم اور قومی قوم بنا کر

کھڑا کر دیتا ہے۔

جب کبھی دو قوموں کا مقابلہ ہوگا تو ہمیشہ اس کو فتح ہو گی، جس کا نقطہ تخیل زبردست ہوگا، اور جس کے افراد اس رشتہ حیات میں سب سے زیادہ مستحکم بندھے ہوں گے، اور جو اس مشترک اساس وبنیاد پر سب سے زیادہ متفق ومتحد ہونگے، عربوں نے اسی قوت سے قیصر وکسریٰ کو شکست فاش دی، عربوں کے پاس ایرانیوں کے خزانے اور نہ رومیوں کے اسلحہ تھے۔ مگر ان کے پاس وہ قوت ایمانی تھی جس سے ایرانی اور رومی محروم تھے۔

جب کوئی قوم تنزل پذیر ہوتی ہے، تو اس کی وہی قوت ایمانی کمزور ہو جاتی ہے، اس کی وہی مشترک اساس وبنیاد منہدم ہونے لگتی ہے، اور قوم کی زندگی کا مقصد اس مشترکہ قومی غرض وغایت سے ہٹ کر اپنے اپنے نفس، اپنے اپنے خاندان، اپنی اپنی جماعت میں ہٹ جاتا ہے، اسلئے اس میں قومی خائن پیدا ہوتے ہیں، جن کے پیش نظر اس مشترکہ جامعیت کے فوائد ونقصانات کے بجائے خود اپنی ذات وخاندان کا فائدہ ونقصان ہوتا ہے۔

مٹھی بھر انگریزوں نے ہندوستان کے روپے سے، ہندوستان کے سپاہیوں سے، خود ہندوستان کو فتح کیا، حالانکہ اس وقت پورے ملک میں اودھ، روہیلکھنڈ، بنگال، مرہٹہ، میسور، حیدرآباد کی ایسی عظیم الشان طاقتیں تھیں، جن کے بس میں تھا کہ انگریزوں کو پوری طرح شکست دیدیں، مگر ایسا نہ ہو سکا، اس لئے کہ انگریزوں کے سامنے ایک متحدہ مشترکہ تخیل تھا جس پر پوری قوم متفق تھی۔ جو انگریز جہاں بھی تھا چاہے وہ سپاہی ہو یا گودام کا کلرک ہو، یا سوداگر ہو، یا ڈاکٹر ہو، یا جنرل ہو، یا گورنر ہو، ہر ایک کے سامنے ایک ہی بلند مقصد تھا، اور وہ انگلستان کی سربلندی اور عظمت، لیکن ہندوستانیوں کے سامنے باوجود طاقت وقوت کے کوئی ایک متحدہ غرض، مشترکہ

جامعیت' واحد اساس کار اور متفقہ بنیاد عمل نہ تھی' جس کا بچاؤ جس کی حفاظت اور جس کا اعلاء پوری قوم کی غرض و غایت اور بنیاد و اساس ہوتی' ہر نواب' ہر رئیس ہر سپہ سالار' ہر سپاہی' اور ہر نوکر کا مقصد اپنی فکر اور اپنی ترقی تھی' اس حالت میں نتیجہ معلوم۔

اب ایک اور حیثیت سے نظر ڈالئے' دنیا کی ہر متمدن قوم کے پورے نظام زندگی کا ایک اصل الاصول ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ آج روسی بالشوسٹ کے سارے نظام کا ایک واحد نقطۂ خیال ہے۔ اور وہ سرمایہ داری کی مخالفت ہے' جو اس نظام کی اصل اساس ہے' اب جس قدر اس نظام کی شاخیں' شعبے' صیغے اور کام ہیں سب ایک اصل الاصول یعنی "سرمایہ داری کی مخالفت" پر مبنی ہیں' اسی طرح ہر ترقی یافتہ قوم کے تمدن اور نظام ہستی کا ایک اصولی نقطہ ہوتا ہے' جس کے تحت میں اس تمدن اور نظام ہستی کے تمام شعبے اور فروع ہوتے ہیں۔

اسی طرح آج انگریزی جدوجہد کی بنیاد' انگریزی سرمایہ داری' امریکن تمدن کی بنیاد' امریکن سرمایہ داری' نازی تمدن کی بنیاد جرمن قوم کی سربلندی' اور فسسٹ کی بنیاد پرانی رومی قیصریت کی دوبارہ تعمیر پر ہے۔ اگر کسی تمدن اور نظام کا یہ سرا نکال دیا جائے تو اس تمدن کے تمام اجزاء اور اس نظام کے تمام شعبے' بے معنی' بے سود اور بے اساس ہو کر رہ جائیں اور چند ہی روز میں وہ تمام سر رشتے تار عنکبوت ہو کر نابود ہو جائیں' اسی لئے ہر قومی تمدن اور نظام ملت کو سمجھنے کے لئے اس کے اس اساس کار' سر رشتہ خیال' اور اصل الاصول کو سمجھنا چاہیے' جب تک وہ سرا ہاتھ نہ آئے گا اس نظام ملت کا الجھاؤ سلجھ نہیں سکتا۔

ملتوں کا اختلاف متخیلہ کے اختلاف سے ہے

اس نکتہ کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں گو ہزاروں ملتیں اور قومیتیں ہیں' لیکن ان میں سے ہر ایک ملت و قومیت کا اصل انفرادی تشخص' اور امتیازی وجود' اس

کے گوشت' پوست' ہڈی اور رنگ وروغن سے نہیں' یہ تو اوپری سطح اور ظاہری قشر پر کے نشانات اور خطوط ہیں۔ ان کا اصل انفرادی اور مستقل تشخص اور امتیازی وجود ان ایمانیات اور یقینیات سے ہے' جو ہر ایک کے دل میں بسے اور ہر ایک کے رگ وریشہ میں رچے ہوئے ہیں۔

آج ہندوستان میں ہندو' مسلمان' عیسائی' پارسی' جین' سکھ ہزاروں قومیں آباد ہیں شکل وصورت اور رنگ وروپ کے لحاظ سے ان میں کوئی تفاوت نہیں' اگر ہے تو ہر ایک کے اس متخیلہ میں ہے جس سے اس کی ملت کی تعمیر ہوئی ہے اس لئے کسی ملت کے متخیلہ کو بدل دینے کے معنی اس ملت کو مٹا دینے کے مترادف ہے دنیا میں جو کمزور قومیں فنا ہوئی ہیں ان کی صورت یہی ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنا متخیلہ ایمانی چھوڑ کر کسی دوسری طاقت ور قوم کے متخیلہ ایمانی کو قبول کر لیا' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم مٹ گئی' اور دوسری قوم میں ضم ہو کر وہ خود فنا ہو گئی' ہندوستان کے یونانی' سیتھین اور بودھ کیا ہوئے؟ ایرین ہندوؤں میں سما گئے' ایران کے مجوسی کدھر گئے' مسلمانوں میں مل گئے' مصر کے قبطی کہاں گئے' عربوں میں شامل ہو گئے' سسلی اور اسپین کے عرب کیا ہوئے' اٹلی اور اسپین والوں میں گھل گئے۔

تجدید کی سعی بھی اسی متخیلہ کی مدد سے ممکن ہے

کسی قوم وملت کی اس تعمیری حقیقت سے باخبر رہنا صرف اس لئے ضروری نہیں کہ وہ ہے' اور وہ اس سے بنی ہے' بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی تجدید واصلاح کی جب کبھی ضرورت پیش آئے تو اس حقیقت کا واقف کار اسی کے ذریعہ سے اس کی تجدید ومرمت کرے۔ اس کی وہ تعمیری حقیقت وہ ساز ہوتا ہے جس کے چھیڑنے سے اس قومیت وملت کا ہر تار اپنی جگہ پر حرکت کرنے لگتا ہے۔ اہل توحید کے لئے توحید کی آواز اہل صلیب کے لئے صلیب کی پکار گاؤ پرست کے لئے گائے کی

آواز' سحر و طلسم کا حکم رکھتی ہے' جس سے ایک لحہ میں قوم کی قوم میں جان پڑ جاتی ہے اور ست وناکارہ قوم بھی کروٹیں بدلنے لگتی ہے' اور آواز کی طاقت کے مطابق سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔

فرض کرو دنیا میں آج چالیس کروڑ کی تعداد میں ایک ملت آباد ہے جس کا نام مسلمان ہے اس ملت کی حقیقت کیا ہے؟ توحید الٰہی اور رسالت محمدی پر ایمان لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ اگر کوئی اس ملت کی حقیقتِ تعمیری کو مٹاڈالے تو یہ چالیس کروڑ ملت واحدہ چالیس کروڑ قومیتوں میں منقسم ہو کر دم کے دم میں فنا ہو جائے گی اور یہ چالیس کروڑ افراد کا کارواں جو ایک صدائے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے جرس پر حرکت کر رہا ہے اب اس کی حرکت کے لئے مختلف آوازوں کے چالیس کروڑ جرسوں کی ضرورت پیش آئے گی جس سے دنیا کی قوموں کا تصادم بجائے کم ہونے کے حد قیاس سے زیادہ بڑھ جائے گا اور ان کے باہمی جنگ و جدول کوئی ایک متحدہ آواز روک نہیں سکتی۔

الغرض ملت کی یہ تعمیری حقیقت' ہر ملت کی روح ہوتی ہے' اس کی بقاء سے اس کی زندگی' اور اس کی موت سے اس کی فنا ہوتی ہے' یہی ملت کے جسم کا گرم خون ہے جس سے رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے' اور سعی و عمل کی قوت بیدار ہوتی ہے۔

کسی قوم کی اس اساس ملت اور بنیاد تعمیر سے ہٹ کر جب کبھی اس تجدید کا کام کیا جائے گا تو وہ ساری کوشش بے کار جائے گی' فرض کرو کہ ایک ہندو قوم ہے اس کی قومیت کی بنیاد وہ خاص تخیلات و جذبات ہیں جو ہزار سال سے اس میں پیدا ہو کر اس کی حقیقت کے اجزاء بن گئے ہیں۔ ذات پات' چھوت چھات' گائے' اور گنگا' وہ مسالے ہیں جن سے اس کی قومیت کی تعمیر ہوئی ہے بودھ کے عہد سے آج تک مختلف وقتوں

میں بیسیوں ریفارمر اس قوم میں پیدا ہوئے جنھوں نے اس قوم کی ماہیت کے ان اجزاء کو بدل دینا چاہا۔ مگر کیا یہ آج تک ممکن ہوا؟ اور جب کبھی اس آواز میں عارضی کامیابی بھی ہوئی تو بودھ، جین کبیر پنتھی، سکھ قومیں اور الگ الگ بن گئیں، مگر ہندو قومیت اپنی جگہ پر قائم رہی۔

مسلمانوں میں اسلامی حکومت کے زوال کے بعد سے آج تک بیسیوں تحریکیں مسلمانوں کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کی نام سے اٹھیں اور پھیلیں، مگر جو کامیابی مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کو حاصل ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی ذہنی و عملی قوئ کو بیدار کرنے میں جو عظیم الشان کام کیا اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ وہ تجدید اسلام کی اصل اساس، نظام حقیقی کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی تھی، اور اس کے بعد بھی موجودہ زمانہ تک اسی تحریک کو فروغ ہو سکا جو اسی اساس ملت کے نام سے پیش کی جاتی رہی، اس کامیابی کا عارضی اور ہنگامی ہونا دراصل خود کارکنوں اور تحریک کے علم برداروں کے عارضی یقین اور ہنگامی ایمان کا نتیجہ ہے۔

ایمان کے بغیر عمل ممکن نہیں

اب اس تشریح کے بعد اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہو گا کہ دنیا میں کوئی ترقی یافتہ قوم، یا ترقی چاہنے والی قوم ممکن ہی نہیں جس کے پاس چند ایمانیات نہ ہوں، یا یوں کہو کہ چند اصول کار، اصول حیات، یا اصول نظام نہ ہوں، جن سے اس کی قومیت تخلیق ہوتی ہے، اور جن پر اس کی ملت و تمدن و حیات اجتماعی کی عمارت قائم ہوتی ہے اور جو اس کے منتشر افراد کے درمیان رشتہ اشتراک کا کام دیتے ہیں، اور جن کے تحت میں اس قوم کے نظام حیات کے تمام شعبے مکمل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ کافر و مشرک قومیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں ان کے بھی تمام اعمال و افعال ان کے

چند یقینی تخیلات اور عقائد کے تحت ہی میں آجاتے ہیں۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ ایمانیات کے بغیر ترقی کے حسن عمل یا انسانیت کی نیکی کردار کا وجود ہوتا ہے' حقائق سے نامحرمی کا ثبوت ہے۔ ایمانیات کے بغیر حسن عمل اور نیکی کردار کیا' بلکہ نفس عمل اور نفس کردار ہی کا وجود ممکن نہیں۔ اب اگر بحث ہو سکتی ہے۔ تو اس میں نہیں کہ ایمانیات کے بغیر حسن عمل اور نیکی کردار کا وجود ہو سکتا ہے یا نہیں بلکہ اس میں کہ ان ایمانیات کے تحت میں حسن عمل اور نیکی کردار کا وجود زیادہ بہتر ہو سکتا ہے' یا ان ایمانیات کے تحت میں؟ لیکن یہ نہیں کوئی کہہ سکتا کہ کسی ایمان کے بغیر کوئی عمل کسی نظام حیات کے بغیر کوئی بلند کارنامہ حیات' اور کسی بنیاد کے بغیر کوئی مستحکم عمارت قائم ہو سکتی ہے' آپ اس کا نام انسانیت رکھیں' قومیت رکھیں' وطنیت رکھیں' بالشوزم رکھیں' بت پرستی رکھیں' یا توحید یا خداشناسی رکھیں' جو چاہے رکھیں اور جو چاہے قرار دیں' بہر حال یہ مقدمہ اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ ایمان کے بغیر عمل صالح کا وجود ممکن ہی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارا وہ اساسی خیال' جس پر ہماری ملت کی بنیاد ہو' اور جو ہمارے تمام اعمال کا سرچشمہ بنے کیا ہونا چاہیے؟

نسل و وطن کے عقیدہ کی ناکامی

دنیا کی قوموں نے اساس ملت کی بنیاد جغرافی حدود اور نسلی خصوصیت کو قرار دیا۔ رومیوں کی ہزار سالہ حکومت' رومی وطنیت کے سہارے پر قائم رہی' ہندوؤں' پارسیوں اور یہودیوں کی قومیت نسلی امتیاز پر مبنی ہے۔ یورپ کی موجودہ قومیتیں' نسل و وطن کی دہری دیواروں پر کھڑی ہیں۔ لیکن خود غور کرو کہ جغرافی حدود' اور نسلی و وطنی خصوصیات نے قوموں کو کتنا دل تنگ' محدود خیال' اور متعصب بنا دیا ہے۔ دنیا کی اکثر خوں ریزیاں' لڑائیاں' اور قومی منافرتیں ان ہی جذبات نے پیدا کی ہیں

قدیم تاریخ میں ایران وروم کی صد سالہ جنگ اور خود یورپ کی گزشتہ عالمگیر جنگ جس میں انسانوں نے انسانوں کو درندوں کی طرح چیرا اور پھاڑا' اسی نسلی و وطنی جذبات کی شعلہ افروزی تھی' اور آج کا خونی تماشا بھی اسی جذبہ کا نتیجہ ہے۔

یہ نسلی اور وطنی افتراق قوموں کے درمیان وہ خلیج ہے' جس کو انسانوں کے ہاتھ کبھی پاٹ نہیں سکتے' نہ تو فطرۃً کسی نسل و قومیت کا کوئی پیدا شدہ انسان دوسری نسل و قومیت میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ایک مقام کا پیدا شدہ دوسرے مقام کا پیدا شدہ بن سکتا ہے۔ نہ کالا گورا بن سکتا ہے' نہ گورا کالا' اور نہ فرنگی زنگی بن سکتا ہے نہ زنگی فرنگی' نہ جرمن کو انگریز بنایا جا سکتا ہے' نہ انگریز کو جرمن' نہ افغانی ہندوستانی بن سکتا ہے' نہ ہندوستانی افغانی' آج پولینڈ کے کھنڈروں سے لیکر رومانیا کے روغنی چشموں تک جو زمین خون سے لالہ زار ہے اس کا سینہ کیا اسی نسلی و وطنی خونخواریوں سے داغ دار نہیں؟

غرض نسل و وطن کے دائرے اس مضبوطی سے فطرۃً محدود ہیں کہ ان کے اندر تمام دنیا تو کیا' چند قوموں کے سمانے کی بھی وسعت نہیں ہے ان دونوں کے جذبات و احساسات صرف ایک مختصر و محدود قوم کی جامعیت کا کام دے سکتے ہیں۔ کسی عالمگیر امن و صلح اور انسانی اخوت و برادری کی بنیاد اس پر رکھی ہی نہیں جا سکتی۔

پھر ان دونوں محدود تصورات کے ذریعہ سے اگر انسانوں میں کچھ شریفانہ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں تو وہ ان ہی تنگ جغرافی و نسلی دائروں تک محدود رہیں گے' اور کبھی تمام دنیا کے اس کے اندر سما جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں ان اساسی تصورات کے ذریعہ جن بلند انسانی اخلاق' اور کیرکٹر کا پیدا کرنا مقصود ہے' ان میں سے صرف نسل و وطن کی حفاظت کی خاطر شجاعت' ایثار' اور قربانی کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں' مگر عمومی نیکی' تواضع' خاکساری' رحم' شفقت' عفت' صدق' امانت وغیرہ سینکڑوں ایجابی اور سلبی اخلاق ہیں جو انکے ذریعہ نہ کبھی پیدا ہوئے ہیں نہ ہو سکتے

ہیں۔

آجکل یورپ کی تمام جنگ و جدل اور باہمی ہنگامہ آرائی اور تقابل کا وہ پتھر جس سے ان کی دولت اور تہذیب و تمدن کا شیشہ چور چور ہو رہا ہے' یہی تنگ و محدود وطنیت و قومیت کا عقیدہ ہے' یہ وہ دیوتا ہے جس پر یورپ کی تمام قومیں بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ ہر قوم کے تمام دولت مندوں کی دولتیں' تمام عالموں کا علم تمام سائنسدانوں کی سائنس تمام صناعوں کی صنعتیں' تمام موجدوں کی ایجادیں' اپنی قوم کے سوادنیا کی دوسری انسانی قوموں کی گرفتاری' محکومی' بربادی' اور ہلاکت میں صرف ہو رہی ہیں۔

آج نازازم اور فسزم کا دور ہے۔ جس نے ایک بدترین مذہب کی صورت اختیار کرلی ہے۔ جس میں ہر قسم کی حیوانی قوت کی نمائش' ہر قسم کی ہلاکت اور انسانی بربادی کا مہیب ترین منظر' اور قوت کے دیوتا کے سامنے ہر اخلاقی اور قانونی آئین کی قربانی کا تماشا سب کے سامنے ہے۔ یہ جو کچھ ہے' یہ وہی قومیت اور وطنیت کی خونخوارنہ بت پرستی کا عبرتناک نظارہ ہے' جس سے نوع انسانی کی کسی بھلائی کی توقع نہیں ہو سکتی۔

اقتصادی عقیدہ کا فریب

سوشلزم اور بالشوزم اور دوسرے اقتصادی خیالات سے بھی بھلائی کی توقع نہیں کہ اس نے خود انسانوں کو سرمایہ دار و غیر سرمایہ دار دو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے وہ سب کچھ کیا ہے' اور کرنا چاہتی ہے جو کبھی کسی مذہب اور مذہبی محکمہ تفتیش نے انجام دیا ہے' قوموں کے ساتھ ان کی ناانصافی کا تماشا آج بھی دنیا ترکستان سے لے کر فین لینڈ تک دیکھ رہی ہے۔ اگر زبردستی کوئی بری چیز ہے تو مذہب سے زبردستی روکنا

بھی اتنی ہی بری چیز ہے' جتنا زبردستی سے کسی مذہب کو پھیلانا* اگر مسلمانوں کا گرجاؤں کا توڑنا' اور عیسائیوں کا مسجدوں کا منہدم کرنا ناجائز ہے' تو ملحدوں کا ان دونوں کو مسمار کرنا بھی ناجائز ہے۔

پھر ان تخیلات میں جن کی بنیاد محض پیٹ اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہے کسی میں اخلاقی نصب العین بننے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے اسی لئے ان کا محدود اقتصادی نظریہ پورے نظام ہستی اور نظام زندگی کا معمہ حل نہیں کر سکتا۔

ان سب کے ماوراء یہ ہے کہ ضرورت تو یہ ہے کہ نسلیت وطنیت کے تنگ دائروں سے نکل کر جس عمومی تصور کو اساس ملت بنایا جائے' ان میں بقاء اور دوام کی صلاحیت ہو' سوسائیٹیاں اور جماعتیں جن کی بنیاد کسی مادی خود غرضی اور منفعت اندوزی پر رکھی جائے' وہ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتیں' چنانچہ جب سے دنیا بنی ہے' خدا جانے مادی اغراض کی بناء پر کتنی جماعتیں اور مجلسیں قائم ہوئیں' اور مٹ گئیں' انجمنیں روز بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور سوسائیٹیاں روز پیدا ہوتی ہیں اور مرتی ہیں۔ ایسی ناپائیدار اور سطحی چیزیں جامعیت ملت کی بنیاد اور اساس نہیں بن سکتی ہیں' اور نہ وہ ہمارے نظام حیات کا اصول اور معیار قرار پا سکتی ہیں۔

صحیح ایمان کی ضروری خصوصیات

غرض عالمگیری اور دائمی اساس ملت اور صحیح بنیاد عمل بننے کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز اساس و بنیاد قرار دی جائے اس میں حسب ذیل خصوصیتیں ہوں۔

1- وہ کوئی مادی غرض وغایت کی چیز نہ ہو' جو ہمیشہ بدل جاتی رہے۔

2- وہ کوئی محدود وطنی' نسلی ہت نہ ہو جو اپنے نسل و وطن سے باہر جا کر زندہ

نہ رہ سکے۔

3- وہ قومی، نسلی اور وطنی منافرتوں اور تفرقوں کو بیخ وبنیاد سے اکھاڑ کر عالمگیر اتحاد اور اخوت کی بنیاد ڈال سکے۔

4- وہ تخیل عقیدہ بن کر ہمارے نیک افعال کا محرک، اور برے افعال کا مانع بنے، وہ انسانوں کو نیکی کے لئے ابھار سکے اور برائی سے روک سکے۔

5- وہ ایک ایسا دائمی صحیح اور سچا عقیدہ ہو جس کو مان کر اس برادری میں داخل ہونے میں کسی کو دقت نہ ہو۔

6- وہ ایک طرف بندوں میں اپنے خالق کے ساتھ گرویدگی اور بندگی کا تعلق پیدا کرے، اور دوسری طرف اپنی ہم جنس مخلوقات کے ساتھ محبت اور ادائے حقوق کا جذبہ پیدا کرے۔

اسلام میں عقائد کی حقیقت اور اہمیت

ان چند عقلی مبادی کے ثبوت کے بعد اب آیئے اسلام کے اصول عقائد و مبادی کا جائزہ لیں، اسلام میں جس حقیقت کو عقائد کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت یہی چند مذہبی اصول و مبادی ہیں جو جماعت کا کریڈ اور تمام انسانی افکار وخیالات کی بنیاد و اساس ہیں، انسان کے تمام افعال، اعمال، اور حرکات اسی محور کے گرد چکر کھاتے ہیں یہی وہ نقطہ ہے، جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے، اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہماری اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں

چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں' اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے' فرمایا۔

الاوان فی الجسد مضغۃ اذاصلحت صلح الجسد کلّہ' واذافسدت فسد الجسد کلہ الاوھی القلب (صحیح بخاری کتاب الایمان)	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے' تو تمام بدن درست ہے' اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا' ہاں وہ ٹکڑا دل ہے

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں' سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِیْمٌ (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے' دوسرا اس کے مقابل میں قَلْبٌ اَثِیْمٌ[۱] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو ہمیشہ گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے' اور تیسرا قَلْبٌ مُّنِیْبٌ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے' غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے' ہمارے اعمال کا ہر محرک' ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے' اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے' اسی لئے آپ نے فرمایا۔

اِنَّمَاالْاَ عْمَالُ بِالنِّیَات (صحیح بخاری آغاز کتاب)	تمام کاموں کا دارومدار نیت پر ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا۔

---

(۱) قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ

انما لامرئ مانوىٰ فمن کانت ھجرتہ الٰی دینا یصیبھا اوالیٰ اِمراۃ ینکحھا فھجرتہ الی ماھاجرالیہ
(صحیح بخاری آغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کیلئے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے ثواب حاصل نہ ہوگا)

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے۔ اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے، نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح اور درست نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں جن کو ہم عقیدہ کہتے ہیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کیلئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے، لیکن غور سے دیکھئے کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں۔ وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات، اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسی لئے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح، دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے "ایمان" کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے۔ اور

ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے۔ جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا۔ جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کیۓ تھے' لیکن بااین ہمہ مشرک تھا۔ اس کی نسبت آنحضرت صلعم سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا' کہ "یارسول اللہ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیۓ کیا ان کا ثواب ان کو ملے گا' فرمایا نہیں اے عائشہؓ' کیوں کہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بار آلہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے"(۱)

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا" اے محمد ﷺ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں' کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے" فرمایا۔ کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟" اس نے جواب دیا نہیں' فرمایا "واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔" دوسری دفعہ وہ پھر آیا' اور وہی پہلی درخواست پیش کی۔ مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی' اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے' لیکن آنحضرت صلعم نے اس سے پھر وہی سوال کیا' کہ "کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے؟" اس نے پھر نفی میں جواب دیا' آنحضرت صلعم نے پھر وہی فرمایا کہ "میں کسی مشرک سے مدد نہیں لوں گا' غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی اس کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا' تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی' اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم کو خدا اور رسول ﷺ پر ایمان ہے؟" تو اس نے اثبات میں جواب دیا' تو اسلامی فوج میں ایک مجاہد کی حیثیت سے اس کو داخل ہونے کی اجازت ملی'(۲) اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جماعت میں داخل ہونے کے لئے اس کے کریڈ اور عقیدہ کو تسلیم کرنا اس جماعت کی مضبوطی کی

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ' غزوات نسخہ قلمی دارالمصنفین و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۴۹ مصر
(۲) صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر

سب سے پہلی شناخت ہے۔

غرض اسلام کے نقطہ نگاہ سے بھی ایمان ہی ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے۔ جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے' وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں۔ مگر روحانی اثر و فائدے سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں' خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے' یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں' وہ ہمارے دل کا نور ہے' وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد' ریا' نمائش' جاہ پسندی' خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

ایمان کے اجزاء

اسلام نے چونکہ علم و عمل' تصور اور فعل' عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا ہے اور عقائد کی راہ سے یہی اصل زور انسان کی عملیت پر صرف کیا ہے اس لئے اس نے عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا ہے' جو عمل کی بنیاد' اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے' اور دل کی اصلاح و تزکیہ میں کام آسکے' اور اسی لئے اس نے عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا' چند سیدھے سادے اصول ہیں' جو تمام ذہنی سچائیوں' اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں' اور ان ہی پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے اور صریح الفاظ میں اس ایمان کے صرف پانچ اصول تلقین کئے۔ (۱) خدا پر ایمان' (۲) خدا کے

فرشتوں پر ایمان' (۳) خدا کے رسولوں پر ایمان' (۴) خدا کی کتابوں پر ایمان' اور (۵) اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

اُن اجزائے ایمانی کی حکمت

اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے' اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ' مقصود قرار پا سکے اور اس کی رضاجوئی اور اس کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو' اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں۔ اور ہر نیکی کو اس لئے کریں' اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے' اس طرح اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں' اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں' ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا وہوس کی آمیزش سے پاک ہو' اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات' ہمارے غلط استدلالات' ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے' کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے' اگر اس کی صداقت سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی' نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے' جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے' صحیح اور غلط کاموں کے درمیاں ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے' کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہو گی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے' کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں

کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں' مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں' مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ "ریکارڈ" کرتے جاتے ہیں' تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا بر امعاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ہیں ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں میں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں۔ اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے' ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی اور بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ' جاہل و عالم' بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا یقین اور اسکے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے' اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے' اور اسی لئے محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ پر' اس کے تمام رسولوں پر' اس کی کتابوں پر' اس کے فرشتوں پر' اور روز جزاء پر ایمان لانا' یہی عقائد خمسہ یکجا طور پر سورۃ بقر میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

اَلَّذِينَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ۔۱)	جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات اور ملائکہ) پر ایمان رکھتے ہیں۔
وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (بقرہ۔۱) وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ۔۱)	اور جو کچھ تم پر (اے محمد ﷺ) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء اور ان کی کتابوں پر) اور آخرت (روزِ جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورۃ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورۃ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (بقرہ۲۲)	اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر، فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورۃ کے آخر میں ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ۔۴۰)	پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا، اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے یہ سب لوگ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے

سورۃ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى	"اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے

وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ؕ	اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری' اور جو شخص خدا کا' اس کے فرشتوں کا' اس کی کتابوں کا' اس کے پیغمبروں کا' اور روز آخرت کا انکار کریگا' وہ سخت گمراہ ہوا'

ایمان و عمل کا تلازم

سچے ایمان اور حسن عمل در حقیقت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ایک مومن بدکار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو یہ سوال حقیقت میں خود تضاد کو مستلزم ہے' اس لئے احادیث میں آتا ہے کہ کوئی مومن ہو کر بدکاری اور چوری نہیں کر سکتا' اگر کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان مسلوب ہو جاتا ہے' اور یہ بالکل واضح ہے کہ جب کوئی مومن برائی کرنا چاہتا ہے تو اس کے ایمان یعنی اصول اور جذبات فاسدہ کے درمیان کشمکش ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر یہ لڑائی قائم رہتی ہے' اگر ایمان اور اصول نے فتح پائی تو وہ اپنے کو بچا لیتا ہے' اور اگر جذبات غالب آتے ہیں' تو ایمان اور اصول کا تخیل اس وقت دب کر اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر سچا مومن' اور بدکردار ہو' یہ ممکن ہی نہیں' اگر ہے تو حقیقت میں ایمان ہی کامل نہیں۔ یہاں بحث رسمی ایمان و مومن سے نہیں بلکہ اس ایمان سے ہے۔ جسکے معنی غیر متزلزل یقین' اور ناقابل شک اعتقاد کے ہیں' جہاں کہیں رسمی و ظاہری ایمان کے ساتھ برائی اور بدکرداری کا وجود ہے' وہ درحقیقت ایمان کا نقص اور یقین کی کمی کے باعث ہے' عملِ صالح کی کمی بھی ایمان ہی کی کمی کا نتیجہ ہے۔

ایمان کے بغیر کوئی عمل درست نہیں

لیکن بہر حال عقلی فرض اور رسمی ایمان کے لحاظ سے یہ سوال ہو سکتا ہے' اور یہ مانا جا سکتا ہے کہ ایک بد کردار مومن اور نیک اخلاق کا فرو مشرک میں اگر پہلا نجات کا مستحق ہے اور دوسرا نہیں ہے تو ایسا کیوں ؟ اس کا جواب شرعی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے بالکل ظاہر ہے' اسلام نے نجات کا مدار ایمان اور عمل دونوں پر رکھا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلاَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ (عصر)

بے شک کل انسان گھاٹے میں ہیں مگر وہ جو ایمان رکھتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں۔

اس لئے کامل نجات کا مستحق وہی ہے' جو مومن بھی ہے اور نیک کردار بھی ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو خدا کفر و شرک کے گناہ کے سوا اپنے بندہ کو ہر گناہ چاہے تو معاف کر سکتا ہے' البتہ شرک و کفر کو معاف نہ فرمائے گا' اور اس کی سزا ضروری وہ دے گا' چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لاَ یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرُكَ بِه وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِكُ بِاللّٰه فَقَدِ افْتَرٰیٓ اِثْمًا عَظِیْمًا ط (نساء ۷)

بے شک خدا اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' اور اس کے سوا دوسرے گناہ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا"۔

ایک اور آیت میں مشرکوں کے متعلق یہ قطعی طور پر فرمایا۔

اِنَّه مَنْ یُّشْرِكُ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَمَا وٰاهُ النَّارُ (مائدہ۔۱۰)

بیشک یہ بات ہے کہ جو اللہ کے ساتھ شرک کریگا تو اللہ نے اس پر اپنی جنت حرام کی ہے"

قرآنِ پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں' اور ان کا کوئی وجود پھر باقی نہیں رہتا'

اسی طرح وہ شخص جو ایمان سے محروم ہیں ان کے کام بھی بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ط ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ط

(ابراہیم ۱۸)

جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس راکھ کی ہے، جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ط

(نور ۔ ۵)

جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

ان کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا، اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ط ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ط وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (نور)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو، یہ اندھیرا ہے کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کیلئے کوئی نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی' اس لئے ریا' نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاتی' وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں' لیکن کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے' اخلاقی نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے اس بنا پر آنحضرت صلعم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ط لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ط (بقرہ ۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان اور اُلاہنے دے کر اس طرح برباد نہ کرو' جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کیلئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا' اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے' جس پر کچھ مٹی پڑی ہو۔ ذرا اس پر پانی برسا تو مٹی دُھل گئی اور پتھر رہ گیا' جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اُگے گا نہیں۔

مومن و کافر کا فرق

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ ایک بد کردار رسمی مومن کے لئے نجات کی امید ممکن ہے' لیکن ایک حقیقی کافر و مشرک کیلئے نہیں۔ اور اس کی عقلی وجہ ظاہر ہے ایک بد کردار رسمی مومن اور حقیقی کافر و مشرک کے درمیان وہی فرق ہے جو ایک چور اور ڈاکو کے درمیان ہے' ہر قانون داں جانتا ہے کہ ان دونوں میں قانون کی نظر میں کون مجرم زیادہ ہے' چور گو برائی کرتا ہے تاہم حکومت کا خوف اسکے دل میں ہے' مگر ڈاکو حکومت سے بر سر پیکار ہو کر قتل و غارت کا مرتکب ہوتا ہے' اس لئے ڈاکو' چور سے زیادہ سزا کا مستحق ہے' بد کردار رسمی مومن گو گنہگار ہے' مگر کبھی کبھی خوف الٰہی سے تھرا جاتا ہے' کبھی کبھی خدا کی بارگاہ میں گڑگڑاتا ہے' اور کبھی اپنے گناہوں پر خدا

کے حضور میں شرمندہ اور نادم بھی ہوتا ہے، مگر کافر و مشرک، اگر کچھ اچھے کام بھی کریں، تاہم اپنی دوسری برائیوں کے استغفار کیلئے خدا کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے، وہ خدا نام کسی ہستی کے قائل ہی نہیں، جس کے خوف سے وہ تھرائیں، جس کی بارگاہ میں وہ گڑگڑائیں، اور جس کی محبت میں سرشار ہو کر وہ اس کے احکام کی تعمیل کریں، اس لئے اس مجرم کیلئے جس نے کسی مجبوری سے معذور ہو کر چھپ کر کسی قانون سلطنت کی نافرمانی کی رحم و بخشش کا موقع ہے، لیکن اس باغی کیلئے جو سرے سے سلطان وقت کو اور اسکے قانون کو تسلیم نہیں کرتا رحم و بخشش کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن یہ محض ایک تمثیل تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ اس کے بندے اس کی حکومت کو تسلیم کریں ان الله غنی عن العالمین[۷] (بیشک خدا دنیا سے بے نیاز ہے)

بلکہ اصل یہ ہے کہ ایک کافر و مشرک اس اصول کار کو تسلیم نہیں کرتا، جس پر مذہبی نیکیوں کی بنیاد ہے، اور ایک رسمی مومن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے اس کی نسبت توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ آج نہیں تو کل عمل بھی کریگا، لیکن جو ہنوز اصول کا مخالف ہے اس کے لوٹنے کے لئے ابھی بڑی دشوار منزل باقی ہے۔

ایمان یعنی اساس ملت اور بنیاد عمل کی اہمیت

اس خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ہٹ کر بھی اگر مومن و کافر کے باہمی فرق و امتیاز پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ بہت سے بظاہر نیک لوگوں کو جو کافر ہیں اپنے سے الگ کرنا پڑتا ہے اور بہت سے بظاہر برے لوگوں کو جو مومن ہیں اپنے اندر داخل کرنا پڑتا ہے، تاہم اس موقع پر اس نکتہ کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اس "اپنے" اور "غیر" کی وجہ تقسیم کیا ہے؟ جب اس وجہ تقسیم کو ہم سامنے رکھیں گے تو ہم کو ناگزیر طور پر ایسا کرنا ہی پڑیگا۔ وجہ تقسیم خیرات کرنیوالا اور نہ خیرات کرنے والا، یا جھوٹ بولنے والا، اور نہ جھوٹ بولنے والا نہیں ہے بلکہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والا اور ایک دستور العمل (قرآن) کو صحیح ماننے والا ہے، اس بناء پر اس وجہ تقسیم کی رو سے ایسا ہونا لازم ہے۔

یہ طریقہ امتیاز کچھ اسلام یا مذہب کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ ہر تحریک ہر جماعت اور ہر اصول سیاست' بلکہ تمام انسانی تحریکات اور جماعتوں کا اصول تقسیم یہی ہے' ہر تحریک کا ایک نصب العین' اور ہر جماعت کا ایک عقیدہ (کریڈ) ہوتا ہے' کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کریڈ کے مطابق پورے جوش و خروش کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ یہ اس مذہب کے مومنین اور صالحین ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اس کریڈ کو گو صحیح تسلیم کرتے ہیں' مگر تغافل ہستی' یا کسی اور عارضی سبب سے اس کریڈ کے مطابق عمل نہیں رکھتے' یہ اس مذہب کے غیر صالح مومنین ہیں' لیکن ایک تیسری جماعت ہے جو سرے سے اس کریڈ ہی کو تسلیم نہیں کرتی' اور نہ اسکو بنیاد عمل قرار دیتی ہے۔ گو اس تیسری جماعت کے بعض افراد بڑے فیاض و مخیر ہوئے ہوں یا بڑے عالم و فاضل ہوں' تاہم اس جماعت کے دائرہ کے اندر جس کا وہ کریڈ ہے ان کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے' کیا یہی وجہ نہیں کہ ایک سیاسی جماعت کے کریڈ پر یقین رکھنے والا اور اس کے مطابق کرنے والا اور وہ بھی جو نفس کریڈ کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے مطابق عمل پیرا نہیں اس جماعت کے پنڈال میں جگہ پاسکتا ہے؟ مگر وہ جو اس کریڈ ہی کو صحیح باور نہیں کرتا' اس کے احاطہ میں کوئی جگہ پانے کا مستحق نہیں ہے اسی پر ہر جماعت کے اصول کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب تک کوئی جماعت اپنے اصول کار' اساس جماعت اور عقیدہ کو اتنی اہمیت نہ دے گی' اس کی اہمیت جو سب اہمیتوں سے بڑھ کر ہونی چاہیے قائم نہیں رہ سکتی۔ اور ملت کی وہ دیوار جس کو اس قدر سخت اور مستحکم ہونا چاہیے کہ باہر کے سیلاب کا ایک قطرہ بھی اس کے اندر نہ جاسکے' اگر اس میں اصول و عقیدہ پر ایمان کا مطالبہ کیئے بغیر ہر کس و ناکس کو داخلہ کی اجازت دے دی جائے تو اس مستحکم دیوار میں یقیناً رخنے پڑ جائیں گے اور وہ ایک لمحہ کیلئے بھی کسی سیلاب کا مقابلہ نہیں کرسکتی' اور وہ

جماعت ایسے پراگندہ اصول و افراد کا مجموعہ ہو گی، جس کو کسی اتحاد و اشتراک و جامعیت کا رشتہ باہم متحد و مشترک و مجموع نہیں کرتا۔

مستحکم جماعتیں وہ ہیں جو اپنے کریڈ پر شدت کے ساتھ جمی رہتی ہیں۔ اور جو اس کریڈ کو تسلیم نہیں کرتا، رکن جماعت نہ ہونے کی حیثیت سے وہ ان کی جماعتی برادری میں کوئی اعزاز نہیں رکھتا۔ کیا ایک مسلمان جب کہ کسی سیاسی جماعت کا رکن ہو تو اس کیلئے تو اصول کار کی یہ سختی جائز بلکہ مستحسن ہو، مگر وہی اسلامی جماعت کے ممبر کی حیثیت سے اپنے اخلاقی اصول کار، اساس ملت اور مذہبی بنائے وحدت میں یہ شدت روا رکھے تو کس عقل سے وہ ملامت کے قابل ٹھہرایا جائے، حالانکہ ہر دلی عقیدہ کا لازمی نتیجہ اسی قسم کی شدت اور استحکام ہونا چاہیے، پھر اگر ایک جگہ وہ ہو اور دوسری جگہ نہ ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ایک کو دل کیساتھ جو تعلق ہے، وہ دوسرے کو نہیں۔

نظام اسلام

اب اگر اسلام اور اسلام کے قانون اور مذہب کو سمجھنا ہے تو اس کی اصل بنیاد پر نظر رکھنا چاہیے، جس پر اس کی پوری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ وہ بنیاد اقتصادیات کا کوئی نکتہ، دولت کا کوئی خزانہ، نسل و رنگ کا کوئی امتیاز اور ملک و وطن کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ہے، اور وہ دنیا کی سب سے بڑی، لازوال اور وسیع و عالمگیر صداقت، یعنی خدائے واحد پر ایمان ہے، یہ ہے اسلام کی ملت اور برادری کا اصل رشتہ، اسی سے اس کے مذہب اور اس کے قانون کی تمام تقسیمیں اور امتیازات کی حدیں قائم ہوئی ہیں، اس کی حیثیت اسلام کی مملکت میں وہ ہے جو کل روم میں رومیت کی، اور آج روس میں اصول بالشویت کی ہے۔

اس برادری کے دینی اور دنیاوی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس جماعت کے فارمولے پر دستخط کرے' اور اس کے کریڈ کو دل و جان سے قبول کرے' آج تمام مہذب دنیا کسی عالمگیر برادری کی بنیاد کو تلاش کرنے میں حیران و سرگرداں ہیں' مگر نہیں ملتی' حالانکہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی طرح آج بھی اسلام یہ آواز بلند کر رہا ہے:۔

"اے اہل کتاب آؤ! ہم اس ایک بات پر متفق ہو جائیں' جو ہمارے اور تمہارے نزدیک یکساں ہے' کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں' اور خدا کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں"

یہی توحید اسلام کا وہ نظام نامہ ہے جس پر اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کی بنیاد ہے۔

توحید' دنیا کی غیر متبدل حقیقت

یہ توحید یعنی عرصۂ ہستی کا صرف ایک فرماں روائے مطلق ماننا جس کے سامنے ہر جسمانی و روحانی طاقت ادب سے جھکی ہوئی ہے' اور اس کی بندۂ فرمان ہے' اور ساری دنیا اسی ایک کی مخلوق و محکوم ہے' اور دنیا کی ساری قومیں اس کے آگے بحیثیت مخلوق کے برابر حیثیت رکھتی ہیں' دنیا کی وہ عظیم الشان حقیقت ہے جو سر تا پا صداقت اور حق ہے اور ایسی عالمگیر ہے جو عرصۂ وجود کے ایک ایک ذرہ کو محیط ہے' اور ایسی لازوال جس کو کبھی فنا نہیں اور ایسی کھلی اور واضح کہ جس کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں' اور ایسی خیر مجسم جو ہمارے اندر ہر قسم کی نیکیوں کی تحریک کرتی ہے۔ اور جو ایسی تسکین اور تسلی ہو جو ہر مصیبت اور مشکل کے وقت ہمارے لئے صبر و استقلال کی چٹان بن جاتی ہے' اور ایسا مضبوط اور مستحکم سر رشتہ جو کسی وقت ٹوٹ نہیں سکتا' اور اس قدر وسیع کہ جس کے احاطہ عام کے اندر مخلوقات کی ایک ایک فرد داخل ہو کر اخلاقی حقوق و واجبات کی برادری قائم کر سکتی ہے۔ اور خالق و مخلوق دونوں کی وابستگی

اور محبت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

غرض یہ ایسی عالمگیر حقیقت ہے' جو سر تا پا صداقت اور حق ہے' جو کبھی نہ بدل سکتی نہ بدلے گی' زبانوں میں جو انقلاب ہو' خیالات میں جو تغیر ہو' تمدنوں میں جو اتار چڑھاؤ ہو' قوموں میں جو تفرقے پیدا ہوں' مجازی حقیقتوں' مادی فائدوں اور سیاسی غایتوں میں جو اختلاف بھی پیدا ہو' مگر وہ ایک حقیقت ہے جو اپنی جگہ پر مسلم رہے گی' اور جس میں کوئی تغیر اور انقلاب پیدا نہ ہو گا' کیونکہ اس کی بنیاد ایک ایسی لازوال ہستی کے یقین پر ہے' جو مادیات کی دنیا کی طرح دم بدم مٹتی اور بنتی' اور لحظہ بہ لحظہ متغیر اور منقلب نہیں۔

وہ ایک ایسی عالمگیر اور محیط ہستی کا تخیل ہے' جس کے احاطہ عام کے اندر تمام قومیں' تمام مملکتیں بلکہ تمام مخلوقات یکساں استحقاق کے ساتھ داخل ہیں اس کی ملکیت میں سیاہ و سپید' زنگی و رومی' ہندی و فرنگی' عربی و عجمی' امیر و غریب' عورت و مرد' شاہ پسند و جمہوریت پسند' حاکم و محکوم' آقا اور غلام' عالم اور جاہل' سب برابری کے ساتھ یکساں شامل ہیں' اور اس سے ایسی برادری کا رشتہ قائم ہوتا ہے' جو قوموں میں میل' مملکتوں میں اتحاد اور مخلوقات میں فرائض و واجبات کا احساس پیدا کرتا ہے۔

وہ خود مجسم خیر' اور سر تا پا نیکی ہے' اس کی عقیدت اور محبت ہمارے اندر نیکیوں کی تحریک اور برائیوں کی نفرت پیدا کرتی ہے' تاریکی میں بھی اس کی دیکھنے والی آنکھوں اور خلوتوں میں بھی اس کی جھانکنے والی نگاہوں کا سچا عقیدہ' نازک سے نازک موقع پر بھی ہم کو برائیوں سے بچاتا اور نیکیوں کے لئے ابھارتا ہے۔

جب ہمارا سہارا ٹوٹ جاتا ہے' ہر اعتماد شکست ہو جاتا ہے اور ہر امید منقطع ہو جاتی ہے اور جب افراد و قوم کے صبر و استقلال کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں' اور ان کے وجود کی کشتی منجدھار میں پھنس جاتی ہے' اس وقت اسی ایک کی مدد کا سہارا کام آتا ہے۔

اور اسی ایک کی نصرت کا وثوق فتح و ظفر سے ہم کنار کرتا ہے۔ اور مایوسیوں اور نا امیدیوں کے ہر بادل کو چھانٹ کر رحمت الٰہی کے نور سے آنکھوں کو پُر نور اور دلوں کو مسرور کر دیتا ہے۔

اب کوئی بتائے کہ کسی ایسی قوم کے لئے جو اپنے کو دائمی اور ہمیشہ کے لئے روئے زمین پر آئی ہو اور آخر الامم اور غیر منسوخ ملت ہونے کی مدعی ہو' اس کے اساس ملت بننے کے لئے ہر روز بدل جانے والے' اور ہر صدی میں منقلب ہو جانے والے تخیلات اور نظریئے کبھی اساس ملت قرار پا سکتے ہیں' اور ایسی قوم کے لئے جو کسی نسل' کسی رنگت' اور کسی قطعہ زمین میں اپنے کو محدود نہ کرے' اس عالمگیر خدائی برادری سے بڑھ کر کوئی برادری مناسب ہو سکتی ہے۔

عقیدہ توحید کی اخلاقی حیثیت

پھر ایسا عقیدہ جو تنہا ہماری ملت کا اساس ہی نہ ہو' بلکہ ہمارے عمل کی بھی بنیاد ہو' اس خلاق عالم اور علام الغیوب کے ایمان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے' یہ لازوال اور زندہ جاوید ہستی' ہماری ملت کو لازوال اور زندہ جاوید بناتی ہے' یہ عالمگیر اور محیط ہستی ہمارے اندر عالمگیر اخوت اور عمومی برادری کا رشتہ قائم کرتی ہے وہ خیر مجسم اور سراپا نیک ہستی ہم کو خیر کی دعوت اور نیکی کی صدا دیتی ہے۔ اس کے کمالی اوصاف ہم کو اپنے اخلاقی کمال کا نصب العین عطا کرتے ہیں' اس کے اسماء حسنٰی اور صفاتِ کاملہ کا عقیدہ ہم کو ہر حیثیت سے حسین اور کامل بننے کا درس دیتا ہے۔

اس سے ظاہر ہو گا کہ خدا اور اس کی ذات و صفات پر اعتقاد محض نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتا' بلکہ اس کی حیثیت تمام تر عملی ہے۔ اس کی صفات عالیہ ہمارے اوصاف حسنہ کے لئے نمونہ ہیں' اور اس کی محامد کریمہ ہمارے اعمال و اخلاق کی تصحیح

کے لئے تحریر اوراق کا مسطر ہیں۔

خیر و شر کی تمیز

جس طرح دنیا کی دوسری چیزیں فی نفسہٖ نہ خیر ہیں نہ شر ہم ان کی خیر یا شر صرف ان کے موقع استعمال کے لحاظ سے کہتے ہیں۔ آگ فی نفسہٖ نہ خیر ہے نہ شر، لیکن جب کوئی ظالم اس آگ سے کسی غریب کا جھونپڑا جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے تو وہ شر ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اسی آگ سے کوئی رحم دل انسان چولہا گرم کر کے کسی بھوکے کے لئے کھانا پکاتا ہے تو وہ خیر ہو جاتی ہے، اسی طرح نیک و بد اعمال بظاہر یکساں ہیں، اور ان میں نیک و بد کی تمیز نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ اس غرض و غایت کا لحاظ نہ کیا جائے جس کے لئے وہ کام کیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکو کا ایک مسافر کو قتل کر دینا اور ایک حکومت کا کسی ڈاکو کو پھانسی دینا، یکساں اتلاف جان کا فعل ہے، لیکن پھر دنیا اگر ایک کو خیر اور ایک کو شر کہتی ہے تو وہ اس غرض و غایت کی بنا پر ہے جس کے لئے یہ دونوں قتل کئے گئے ہیں ڈاکو جب قتل کا مرتکب ہوا ہے، اس سے اس کا مقصود مسافر کے مال پر ظالمانہ قبضہ تھا اور اس راہ میں اس کے مالک کے ناحق قتل کا آخری نتیجہ راستہ کی بدامنی اور ملک کی ویرانی ہے۔ اور سزا دینے والی حکومت کی غرض لوگوں کی جان و مال کی حفاظت، راستہ کا امن، اور ملک کو آباد کرنا ہے، اس لئے پہلا فعل شر اور دوسرا خیر ہے۔

خیر و شر کی فلسفیانہ تحقیق، ان کی باہمی تمیز نہایت مشکل ہے، جس کو نہ ہر عامی و جاہل سمجھ سکتا ہے اور نہ اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ خیر و شر کے اکثر امور پر تمام دنیا متفق ہے۔ اس لئے مذہب نے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک کے لئے ایک آسان

اصول یہ وضع کر دیا کہ وہ تمام باتیں جن کو خدائے تعالیٰ پسند کرتا ہے' خیر ہے اور جن کو ناپسند فرماتا ہے وہ شر ہے' اس کے اس اصول سے نہ خیر و شر کی حقیقت بدلتی ہے' نہ ان کے نفع و ضرر کا پہلو بدلتا ہے' نہ دنیا کے فائدے اور نقصان میں کمی بیشی ہوتی ہے' ہاں یہ ہوتا ہے کہ اس اصول کی تاثیر دلوں میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے کہ جنگلی و صحرائی سے لیکر مہذب و تعلیم یافتہ تک اس اصول کے ماتحت خیر پر عمل کرنے اور شر سے بچنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں جس قدر بھی خیر کا وجود ہے' اور شر سے احتراز ہے وہ اسی پیغمبرانہ تعلیم کا نتیجہ ہے' فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کا نہیں' ارسطو اور اسپنسر کے اصول اخلاق کو پڑھ کر اور سمجھ کر کتنے نیک اور خوش اخلاق پیدا ہوئے' اور مسیح و محمد علیہما السلام کی تعلیم و تاثیر نے کتنوں کو خوش اخلاق اور نیک کردار بنایا' اور آج دنیا میں لندن و نیویارک کے بازاروں سے لے کر افریقہ کے صحراؤں اور جنگلوں اور ہندوستان کے دیہاتوں تک میں نیکی کی اشاعت اور برائی سے پرہیز کی تعلیم انبیاء کے پیروؤں کے ذریعہ ہو رہی ہے یا فلسفیوں کے؟ بالشویکوں کے ذریعہ انجام پا رہی ہے یا نازیوں کے؟ سوشلسٹوں کے ذریعہ یا فسسٹوں کے؟ دل کا چین اخلاق کی طاقت اور عالمگیر انسانی برادری کی دولت اگر ممکن ہے تو وہ صرف اس توحید کے ذریعہ جس کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ اور اس ایمان کی بدولت جس کو اسلام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس کی وسعت میں ساری دنیا آرام کر سکتی ہے' اور جس کے سایہ میں انسانوں کے بنائے ہوئے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں' اور جس کی بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ آسمان و زمین کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو ہٹ جائیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتی۔

خُدا کا آخری پیغام

خدا کا آخری پیغام

بسم اللّٰہ الرحمان الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اسلام

اسلام دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے' وہ دنیا میں مذہب کی تکمیل ہے' وہ اپنے پیغمبر کے الفاظ میں دین الٰہی کی عمارت کا آخری پتھر ہے' وہ فطرت ہے' اور فطرت کے مطابق ہے' وہ دنیا میں اس وقت صلح و امن کا جھنڈا اُڑاتا آیا' جب دنیا خاک و خون میں لتھڑی ہوئی تھی' وہ اس خدا کا منادی ہے' جو رحم مجسم' عدل مجسم' نیکی محض' خیر کل اور امن و امان ہے' وہ ظلم و ستم' بے اطمینانی و اضطراب' شک و شبہ کے طوفانوں سے بھاگ کر امن و مادیٰ کے طلب گاروں کو ایک ہی پناہ کی جگہ بتاتا ہے۔

فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ (الذٰریٰت) ہر طرف سے بھاگ کر اللہ کی طرف جاؤ۔

مخالفین کی نکتہ چینی

اس حقیقت کے باوجود یہ کس قدر افسوسناک ہے کہ مسیحی مبلغین اور یورپین مستشرقین نہایت فخر و غرور اور طعن و طنز کے ساتھ اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے خدا کا جو تخیل اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک جبار' قہار' پر غضب' صاحب جلال و جبروت شہنشاہ ہے جس سے ہمیشہ بندوں کو ڈرتے

اور کانپتے رہنا چاہیے اور اس تخیل کا اثر اسلام کے تمام احکام میں نمایاں ہے' بر خلاف اس کے عیسائی مذہب اس کو محبت' پیار' رحمت اور شفقت کے پیکر میں جلوہ گر کرتا ہے' اور اسی لئے اس کو "باپ" کے نام سے پکارتا ہے' اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نصیحتوں میں نرمی' اور رحم و کرم کا جذبہ غالب ہے۔

مستشرقین اسی اعتراض کو اس صورت میں پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اسلام ایک جنگجو مذہب ہے اس لئے اس کے تخیل میں خدا کی جباری و قہاری اور غیظ و غضب کا تصور سب سے زیادہ ہے' اور اسلام کی یہی کمی تھی جس کو تصوف نے آکر پورا کیا' اور بجائے اس کے کہ فقہا کی طرح خدا کی اطاعت کا مبنیٰ خشیت اور خوف الٰہی کو قرار دیا جائے' انہوں نے خدا کے عشق و محبت کو قرار دیا۔

دعوت عمل

ناآشنایان اسلام کو' اسلام کے متعلق بحث و کاوش کرتے ہوئے یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ محض تخیلی اور خیال آراء مذہب نہیں ہے بلکہ وہ اس عملی دنیا کا عملی مذہب ہے' دنیا میں کروڑوں انسان ہیں' ہر انسان کے پیچھے ہزاروں کام ہیں' اور انسان کے ہر کام کا تعلق دوسرے انسان سے ہے' ان دونوں انسانوں میں کوئی باہمی تعلق ایسا ہونا چاہیے جو ایک کو دوسرے سے پیوستہ کردے۔ ایک کو دوسرے کی طرف جھکادے' اور ایک کا رشتہ دوسرے کے ساتھ جوڑ دے' اس تعلق' اس پیوستگی اور اس رشتہ کو جو چیز پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے' وہ محبت اور خوف کا جذبہ ہے' اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ نفع کی طرف رغبت اور ضرر سے نفرت کا جذبہ ہے۔

امید و بیم

غرض انسان کی تمام تحریکات کا سر بنیاد' محبت و خوف' رغبت نفع اور نفرت ضرر ہے' خدا اور اس کے صفات کے متعلق انسان کے جو خیالات اور تصورات ہیں وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہیں' وحشی اقوام کے مذہبی خیالات پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ وہ فطرت کے مناظر اور موجودات کی پرستش اسی اصول کے مطابق کرتے ہیں' بعض چیزوں سے وہ ڈرتے ہیں' تو وہ ان کی پوجا کرتے ہیں' کہ ان کے ضرر سے محفوظ رہیں' بعض دوسری اشیاء کے لطف و کرم کے متوقع ہوتے ہیں کہ وہ ان کے منافع سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

اب عام انسانی معاملات' اور کاروبار پر غور کرو کہ انسان کی موجودہ فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ دنیا کا یہ نظام' صرف محبت اور رغبت کے جذبات سے چل سکے؟ اگر ایک دن بھی' دنیا کے بازاروں' سلطنتوں کے دفاتر' اور قوموں اور جماعتوں کی مجلسوں اور سوسائٹیوں میں تنہا اس پر عمل ہو' تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے' اور اطاعت و فرمانبرداری کا جس پر تنظیم اور ضابطہ داری (ڈسپلن) کا دارومدار ہے' خاتمہ ہو جائے' اسی طرح اگر صرف نفرت و عداوت اور خوف و خشیت تمام تر عالم کے کاروبار میں دخیل ہو جائے تو یہ دنیا جہنم کا طبقہ بن جائے' اور دلوں کی شگفتگی اور انبساط جو ہماری سرگرمیوں اور ولولوں کا مایہ حیات ہے دفعتہً فنا ہو جائے' اس لئے دنیا کے نظام ان دو گونہ جذبات کے بغیر کبھی قائم نہیں رہ سکتے' انسان اپنے ہر عمل میں ان دونوں کے سہارے کا محتاج ہے۔

ملل قدیمہ

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی

تھی' اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے' یہودی مذہب کی بنا سر تاپا خوف' خشیت اور سخت گیری پر تھی' اس کا خدا "فوجوں کا سپہ سالار" اور باپ کا بدلہ پشتہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا' یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر شاذ و نادر کہیں نظر آئے گا' اس کے بر عکس عیسائیت تمام تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور ہے اس کے "اکلوتے بیٹے کا باپ" تمام انسانوں کا باپ ہے' وہ اپنے "فرزندوں" کے جرم و خطاء سے غضب ناک نہیں' بلکہ پشیمان اور متاسف ہوتا ہے۔

حقیقت اسلام

اس افراط اور تفریط کا نتیجہ یہ ہے کہ یہودیت ایک خشک اور بے لذت مذہب بن گیا' اور عیسائیت اس قدر تر ہے کہ تردامنی اس کے نزدیک عیب نہیں' ایک گنہگار عورت کو یہودیت سنگسار کرنے کا حکم دیتی ہے' لیکن عیسائیت صرف اسی قدر کہتی ہے کہ "جو گنہگار نہ ہو وہ اس عورت کو پتھر مارے' اور اے عورت! جا' پھر ایسا نہ کرنا" اسلام تفصیل کرتا ہے' مجبور و مجنون و مدہوش وغیرہ مستثنیٰ ہیں' بے شوہر عورت اور بن بیوی کے مرد کو کوڑے مارے جائیں' شوہر والی عورت اور بیوی والا مرد سنگسار ہوگا' یہودی مذہب کسی باز پرس کے بغیر ہر حال میں مرد کو طلاق کی اجازت دیتا ہے' ملت عیسوی' کسی حال میں طلاق کا فتویٰ جاری نہیں کرتی' اسلام اس کے متعلق تفصیلی احکام رکھتا ہے' غرض یہی حال اسلام کا تمام دیگر مسائل میں ہے کہ وہ عیسائیت اور یہودیت کے درمیان ہمیشہ بیچ کی راہ اختیار کرتا ہے' اور یہی اسلام کی سب سے بڑی فضیلت ہے' قرآن کہتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا كُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (البقرۃ)

اس طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا کہ لوگوں پر گواہ رہو۔

یہی حال' اعتقادیات کا ہے' وہ نہ تو خدا کو محض جبار' قہار' رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے' اور نہ اس کو مجسم انسان' انسانوں کا باپ' یا محمد صلعم کا باپ' سمجھتا ہے' اور تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے متصف کرتا ہے' وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے' اور رحمٰن و کریم بھی ہے' وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے' اور غفور و رحیم بھی ہے' وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے' اور پیار بھی کرتا ہے' بگاڑتا بھی ہے' اور نوازتا بھی ہے' نفع اور نقصان دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں' اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ٥ (اعراف)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر' چپکے چپکے پکارا کرو' وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا' اور زمین میں اس کی درستی کے بعد فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل و کرم کی) لو لگاتے ہوئے پکارا کرو

اس سے زیادہ پر لطف یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے' مگر اس کو جبار اور قہار کہہ کر نہیں' بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر' خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ۔

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس)	اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا'
مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق)	اور جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اس کے سامنے گنگ ہیں

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (طٰہٰ)	اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کسی حسین اور محبوب چیز کی نسبت' اگر اس کے عاشقوں اور محبت کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ اس کی کونسی ادا تم کو پسند آئی' اس کے کس حصہ میں تم کو حسن و جمال کا مظہر نظر آتا ہے؟ اس کے کس حسن و خوبی نے تم کو فریفتہ کیا ہے؟ تو یقیناً پوری جماعت کا ایک ہی جواب نہ ہو گا' کوئی کسی حصہ کا نام لے گا' کوئی کسی ادا کی تعریف کرے گا' کوئی کسی خوبی کا اپنے کو شیدا بتائے گا' اسی طرح دنیا میں جو پیغمبر آئے وہ کئی قسم کے تھے' ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے خدا کے صرف جلال و کبریائی کا جلوہ تھا' اور اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے' مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ' دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانہ عشق کی طرف بلاتے تھے' مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ہستی آئی جو برزخ کبریٰ' منبع جلال و جمال' اور جامع مستی و ہوشیاری تھی' یعنی محمد رسول اللہ صلعم' ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشک آلود رہتی تھیں' دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم سے مسرور تھا' کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر لوگوں کو نظر آجاتے' چنانچہ

جب راتوں کو آپ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے' قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں' ہر قسم اور ہر معنی کی آیتیں گذرتی جاتیں' جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی' پناہ مانگتے' اور جب کوئی مہر ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا(۱) مانگتے۔

راہ اعتدال

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف وخشیت اور رحم ومحبت کی بیچ کے شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے' اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء "ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے" کہ تنہا خوف' خدا کے رحم وکرم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنادیتا۔ جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں ہم کو تم کو اور سب کو نظر آتا ہے' اور مذہبی حیثیت سے عملاً اس کے نتائج کا مشاہدہ یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جاسکتا ہے کہ ایک ناامید محض اور دوسرا سرتاپا امید ہے۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا' اور اپنے کو "فرزند الٰہی" کا لقب دیا' بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا' اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر' حضرت عزیرؑ کو "فرزند الٰہی" کا رتبہ دیا' لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا' بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کھڑا کرتا ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں' دونوں کا دعویٰ تھا۔

نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاؤُهُ ط (مائدہ) ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

---

(۱) مقدا بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۴

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:۔

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ط بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط (مائدہ)

اگر ایسا ہے تو خدا تم کو تمہارے گناہوں کے عذاب کیوں دیتا ہے اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں بلکہ تم بھی اُنہیں انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِن زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (جمعہ)

اے وہ جو یہودی ہو' اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام' رحمت الٰہی کے تنگ دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا' بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی کہ "خدایا! مجھ کو اور محمد ﷺ کو مغفرت عطا کر آپ نے فرمایا" خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا(۱)" ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ "خدایا! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بھیج' اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر" آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ "یہ زیادہ گمراہ ہے' یا اس کا اونٹ (۲)۔"

غلط فہمی کا سبب

اسلام کے متعلق عیسائیوں نے جو یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ اس کا خدا رحم و کرم' اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرّا ہے' اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ اسلام' عیسائیت کی اس اصطلاح اور طرز ادا کو سخت ناپسند کرتا ہے' جس کے ذریعہ سے

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب=(۲) ابو داؤد کتاب الادب

وہ خدا کے ان اوصاف کو نمایاں کرتی ہے' یعنی باپ اور بیٹے کا لفظ کہ ؟ اس سے گمراہی پھیلتی ہے' یہ گمراہی کچھ عیسائیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اور دوسرے فرقے بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔

اصل یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو یہ فرقے اپنی بولی میں نمایاں کرنا چاہتے ہیں' یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں' اس بنا پر بعض نادان فرقوں نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے بہترین اسلوب سمجھا' چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا جیسا کہ عیسائیوں میں ہے' دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا' اس لئے اس تعلق کو' ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا' اور دیویاں انسانوں کی مائیں بنیں' جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے' خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے' جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے' اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں' اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا جاتا ہے' سدا سہاگ فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

انتہائی ضلالت

دیکھو! یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا' وہ کس قدر راہ سے بھٹک گئے' اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو' بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا' اور لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے' عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ کو بیٹا سمجھ لیا' ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی'

سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں' اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے' اسی لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا' ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی' اور خدا کے لئے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا' لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشاء کو' اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا' بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور ان سے بھی زیادہ وسیع معنی کا طالب ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو' بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

دیکھو! کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کیلئے ناکافی قرار دیتا ہے' اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

خدا کا تصور

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے' اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں' ان کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں' اس لئے ان کے ذہن میں کسی غیر مادی اور غیر جسمانی ذات کا تصور مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا' اور نہ اس کے لئے ان کی لغت

کا کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے' جو غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو' انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور' صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے' اور اس طرح اُن اَن دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس "اَن دیکھی ہستی" کی ذات و صفات کے متعلق' جس کو تم خدا کہتے ہو' ہر مذہب میں ایک تخیل ہے' غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیرووں کے گردو پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے' لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت' جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے' جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے' خدا کے متعلق باپ' ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی' جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد نا ممکن ہے کہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکیں' جیسا کہ تم اعلانیہ دیکھ رہے ہو' اس لئے اسلام نے یہ کیا کہ ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے الفاظ کو' خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا' بلکہ ان کا استعمال بھی شرک و کفر قرار دیا تاہم چونکہ حقائق روحانی کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے' اس لئے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے ان جذبات' احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات مابین کے اظہار کے لئے مستعار لے لیا' جن کا اظہار دوسرے مذاہب نے' ان رشتوں کے ذریعہ کرنا چاہا تھا' اور اسطرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر ربط تعلق کا اظہار اس نے کیا' اور انسانوں کو استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں' ان سے ان کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں' جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے' اور گو ان

کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے' تاہم وہ در حقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گئے ہیں' ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی۔

من موہن

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اَللّٰہُ ہے اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے' اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے' مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وِلاَ ہُ سے نکلا ہے وِلاَ ہُ اور وَلَہٌ اصل معنی عربی میں اس "غم" "محبت" اور "تعلق خاطر" کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے' اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے' اس لئے اَللّٰہُ کے معنی "محبوب اور پیارے" کے ہیں' جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ کائنات کے دل سر گرداں' متحیر اور پریشان ہیں' حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰنؒ گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے' اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

رحمان و رحیم

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے' وہ "رحمان" اور "رحیم" ہیں ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں' یعنی "رحم والا" "مہربان" "لطف و کرم والا" اور پھر یہی اوصاف بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (محبوب' مہربان' رحم والا) قرآن مجید کے ہر سورۃ

کے آغاز میں پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے' ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے' کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل مطلوب ہے۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علم یہی لفظ "رحمان" ہے' جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا لفظ ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى

اس کو محبوب کہو یا مہربان کہو' جو کہہ کر اس کو پکارو' اس کے سب ہی نام اچھے ہیں۔

قرآن مجید نے لفظ بسم اللہ الرحمان الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کو چھوڑ کر 53 موقعوں پر خدا کو اس نام سے پکارا ہے۔

اسمائے الٰہیہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بیسیوں اوصافی نام ہیں' احادیث میں اس کے ننانوے نام گنائے گئے ہیں' ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں' لیکن استقصار کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہیں ناموں کی ہے' جن میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے' قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف اَلوَدُودُ (سورۃ ذات البروج میں) آیا ہے' جس کے معنی "محبوب" اور پیارے" کے ہیں' کہ وہ سر تا پا مہر و محبت' اور عشق اور پیار ہے' اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولیّ ہے' جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں' خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے وہ الرّءُوف ہے "رؤف" کا لفظ "رافت" سے نکلا ہے "رافت" کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر

کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے' اسی طرح خدا کے لئے قرآن مجید میں ایک اور نام حَنَّانٌ آیا ہے جو "حن" سے مشتق ہے' حن اور "حنین" اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے' یہہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں' جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں' دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا ہے' لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے' اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معانی کی تلقین کر رہا ہے۔

ان کے علاوہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات مذکور ہیں' ان کو بھی اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہیے اس کا نام غَفَّارٌ (بخشش کرنے والا) غَفُوْرٌ (بخشنے والا) سَلاَمٌ (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سر تاپا اپنے بے پناہ بندوں کیلئے امن اور سلامتی ہے پھر وہ مُؤمِنٌ (امن دینے والا ہے') وہ اَلْعَدَلُ یعنی سر تاپا انصاف ہے' اَلْعَفُوُّ (معاف کرنے والا ہے) الوھَّابُ (عطا کرنے والا) اَلْحَلِیْمُ (بردبار) اَلصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) اَلْبَرُّ (نیک اور مجسم خیر) اور اَلْمُقسِطُ (منصف اور عادل) ہے ان میں ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

کتب سابقہ

توراۃ کے اسفار اور انجیل کے صحیفوں میں ایک ایک ورق ڈھونڈو کیا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ پُر محبت' یہ سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہودی و نصاریٰ اور ہنود کی طرح

استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس لطف احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے وہ بے بہرہ نہیں جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ روحانی سمجھتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے، جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر، پاک اور سر تاپا روحانی معانی کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس لئے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔

خدا کا آخری پیغام

اسلام، متکلم ازل کا آخری پیغام ہے اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اس قسم کی لغزشوں سے پاک مبرا ہو، حقائق روحانی کی تعبیر کے لئے یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی مذہب کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو ان استعمالات کی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بناء پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے، اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ، ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کر دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، روحانی عشق و محبت کے ان دل آویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ وہ انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اَبٌ (باپ) کے بجائے "رب کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں، بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

"اب اور رب" ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہو گا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل، اسلام کے مطمع نظر سے کس درجہ پست ہے، اب

یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص کیفیت اور مدت سے لیکر ایک محدود عرصہ تک رہتا ہے' اس کے وجود میں اس کو یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے' مگر اس کے قیام وبقاء' زندگی' ضروریات زندگی' سامان حیات' نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی' عہد طفلی تک شاید کچھ اور واسطہ ہو' اس کے بعد تو بچہ اپنے والدین سے الگ' مستقل اور بے نیاز ندگی بسر کرتا ہے' مگر ذرا غور کرو کیا عبدو معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے' کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے' کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔ ا

رب کا مفہوم

ربوبیت (پرورش) عبدو معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک قائم رہتا ہے' جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا' جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے' وہ گہوارہ عدم سے لیکر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر موجودات کا ہاتھ تھامے رہتا ہے' وہ ذرہ ہو یا ایتھر' قطرہ آب ہو' یا قطرہ خون' مضغہ گوشت ہو یا مشت استخوان' شکم مادر میں ہو' یا اس سے باہر' بچہ ہو یا جوان' ادھیڑ ہو یا بوڑھا' کوئی آن' کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے استغنا اور بے نیازی نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت' جسمانیت' ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے' اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے' اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

حقیقت ایمان

اب ہم کو ان آیتوں اور حدیثوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے، جن سے روشن ہو کر اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ مخانہ الست کی سرشاری کی یاد بھیجے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سی بڑی خاصیت اور علامت "حب الٰہی" ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبان الٰہی نے شہادت دی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰه، (بقرہ)	جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہیے ارشاد ہوتا ہے۔

اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِيْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِه وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِه فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِه ط	اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے، خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارا ہے تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

یمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادہ حق سے دوری ہے چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائیگا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کریگا جن کو وہ پیار کریگا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

(مائدہ)

آثار و علائم

حضرت مسیحؑ نے کہا "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامت سے پہچانی جاتی ہے' تم کو زید کی محبت کا دعوئی ہے' مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے' نہ تمہارے سینہ میں صدمہ' فراق کی جلن' اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں' تو کون تمہارے دعوے کی تصدیق کرے گا' اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے' خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کریگا۔

(آل عمران)

طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ)	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (بقرہ)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ (صف)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (توبہ)	اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔

دائمی مسرت

دنیا کے عیش و مسرت' باغ و بہار' شادی و خوشی میں اگر کوئی خیال کا نٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی بہشت کو' فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے' پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے' غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں' جو انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کا چمنستان عیش اس خارزار سے پاک ہو گا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس)	ہاں! خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان' نیکی' درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام "رحم" اور "رحمت" ہے' اسلام کا خدا اتمامتر رحم ہے' اسکی رحمت کے فیض سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے' اسکا نام رحمان ور حیم ہے' جو کچھ یہاں ہے سب اسکی رحمت کا ظہور ہے' وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو' اسی لئے اس کی رحمت سے نا امیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے' مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کیلئے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے' گنہگاروں اور مجرموں کو وہ "میرے بندے" کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر)	اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں' اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے کہ وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیم کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں

وَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِيْنَ	ناامیدوں میں سے نہ ہو'

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے' کہ مرتبہ خلت محبت سے مافوق ہے' جواب دیا۔

وَمَنْ يَقْنَطُ عَنْ رَحْمَةِ رَبِّهٖ اِلَّا الْقَوْمُ الضَّالُّوْنَ (حجر)	اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

خدا کے بندوں کی جانب سے کوئی پابندی عائد نہیں' مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں منجملہ ان کے ایک رحمت ہے'

خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے' وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے' وہ غالب ہے' وہ قاہر ہے' وہ جبار ہے' وہ منتقم ہے' لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور ہے' رحمان ورحیم ہے' رؤف و عفو ہے' اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کر لی ہے۔ اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ — اللہ نے از خود اپنے اوپر مہربانی کرنے کو لازم کر لیا ہے (انعام)

قاصد خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام)

اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ کہ تم پر سلامتی ہو' تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے' کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے' پھر اس کے بعد توبہ کرے اور نیک بنے تو بیشک وہ بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایہ رحمت سے محروم نہیں۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ — اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے۔

(اعراف)

عفو عام کی بشارت

بخاری وترمذی وغیرہ صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے دست خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی' جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا" یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے۔ بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ "اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہونگا' خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں' مجھے پرواہ نہیں' اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائیں' اور پھر تم مجھ سے معافی چاہو تو میں معاف کردوں خواہ تم میں کچھ ہی عیب ہوں مجھے پرواہ نہیں' اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو' پھر تم ہمارے پاس آؤ' اور میرا کسی کو شریک نہ بناتے ہو' تو میں بھی پوری زمین بھر مغفرت لیکر تمہارے پاس آؤں" کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت' اس محبت اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے؟۔

حضرت ابوایوبؓ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا' توانھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی کہ وہ اس کو بخشتا" یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم وکرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں' مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم وکرم اور مہر ومحبت کے عناصر پائے

جاتے ہیں جن کی بناء پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں، اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے، اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایہ محبت کا کتنا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں (۱) "اس لطف و کرم، اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، ؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلعم کے خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آکر کہا" "خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے" رحمتہ للعالمین ﷺ کو صحابہ کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول ﷺ سے محبت ہے" تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

رحمتہ للعالمین ﷺ

ابن ماجہ میں ہے کہ مدینہ میں ایک غریب مسلمان نے وفات پائی، اس کا غم کس نے کیا ہوگا؟ ہاں اس دل نے جو دنیا کا غم خوار بن کر آیا تھا، اس کے فراق ظاہری سے چہرہ مبارک پر اندوہ و ملال کے آثار تھے، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلعم! آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے" فرمایا، ہاں کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت تھی" اس غریب میں اس محبت کا یہ اثر تھا کہ وہ ہمیشہ زور زور سے قرآن پڑھا کرتا تھا،

(۱) جامع ترمذی (باب الدعوات) ودیگر کتب احادیث صحیح

غریبوں کے دل خدا کی محبت کے خزانے ہیں، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا تھا، وہ جب نماز پڑھاتے تھے، تو ہر نماز میں ہر سورۃ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے تھے، جب سفر سے یہ جماعت لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اس نے یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا "ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں" لوگوں نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورۃ میں رحم والے خدا کی صفت بیان ہے، تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے" فرمایا "ان کو بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے" یہ بشارت اسلام کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

المرء مع من احب

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا حاضر ہو کر دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ" قیامت کب آئے گی؟ فرمایا تم نے اس کے لئے کیا سامان کر رکھا ہے" نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کیا" کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا، نہ روزوں کا، اور نہ صدقات و خیرات کا بڑا ذخیرہ ہے، جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس! فرمایا" تو انسان جس سے محبت کرے گا، وہ اسی کے ساتھ رہے گا" صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی کہ صرف خدا اور رسول کی محبت تمام نیکیوں کا بدل اور معاوضہ ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا" جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریلؑ سے اس کا تذکرہ کرتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں، تو جبریلؑ بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور آسمان میں پکار دیتے ہیں کہ خدا اس بندہ کو پیار کرتا ہے، تم بھی پیار کرو، تو آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور پھر زمین میں اس کو ہر

دلعزیزی اور حُسنِ قبول حاصل ہوتا ہے' دیکھو کہ اسلام کا خدا اپنے بندوں سے کس اعلان اور اشتہار کے ساتھ محبت کرتا ہے۔

عطائے عمومی

ترمذی میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلعم سے راوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرا بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو اس قدر ڈھونڈتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں' یہاں تک کہ میں اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے" یہ دولت' یہ نعمت' یہ سعادت اسلام کے دروازے کے سوا کہیں اور سے بھی بٹتی ہے؟

امام بزازؒ نے مسند میں حضرت ابو سعید سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور شہید ہیں' لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے' وہ اچھی باتیں بتاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں" الخ یہ قابل رشک رتبہ اسلام کے سوا اور کون عطا کرتا ہے؟

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا لوگو! "خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے' اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میری اہل بیت سے محبت کرو" یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازلی کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

محبت الٰہی کی طلب

جو کچھ اسلام کی تعلیم تھی، وہ پیغمبر اسلام کی عملی زندگی تھی۔

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا" ہے دیکھو کہ حبیب و محبوب میں، خلوت اور محبت کے کیا کیا نازو نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں میں اور خلوت کی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈھتے اور کیا مانگتے تھے کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے! امام احمد اور بزاز نے مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں، اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلعم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوند!

اسئل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الىٰ حبك (احمد، ترمذی، حاکم)	میں تیری محبت سے مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے، اس کی محبت، اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے۔
اللّٰھم اجعل حبك احبّ الی من نفسی واھلی ومن الماءِ البارد (ترمذی، حاکم)	الٰہی! تو اپنی محبت جان سے اور اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی، دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے، لیکن حضور ﷺ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی، وہ صرف محبت الٰہی ہی کا زلال خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان، روٹی سے جیتے ہیں، مگر ایک عاشق الٰہی (مسیح) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا،

پھر وہ کونسی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا' حضور دعا فرماتے ہیں۔

اَللّٰھم ارزقنی حبك وحب من ینفعنی فی حبك (ترمذی)	خداوندا! تو مجھے اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر

عام ایمان' خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے' مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین میں ہے

من کان اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواہ'	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں' کہ وہ اپنے خدا کو ماں' باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں' اور چونکہ اسلام نے اس طریقہ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے' اس لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہیں' لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ نہیں' بلکہ اسلام کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار کو پست تر اور فروتر سمجھتا ہے' قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جا چکی ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهِ كَذِكْرِ كُمْ اٰبآ ءَ كُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا'	تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ کو یاد کرتے ہو' بلکہ اس سے بہت زیادہ

خدا کی رحمت

احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے' لڑائی کا میدان ہے' دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے' اپنی جان بچا رہا ہے' بھائی بھائی سے ماں بچہ سے' بچہ ماں سے الگ ہے' اسی حال میں ایک عورت آتی ہے' اس میدان حشر میں اس کا بچہ گم ہو گیا ہے' محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کو سامنے نظر آجاتا ہے' بچہ کے جوش محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے' اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے رحمتہ للعالمین ﷺ کی نظر پڑتی ہے' صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے ؟" لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں" فرمایا "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے' خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے" (صحیح بخاری' باب رحمۃ الولد)

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ تشریف لا رہے ہیں' ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لیکر سامنے سے آتی ہے' اور عرض کرتی ہے کہ "یارسول اللہ ﷺ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے' کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے ؟" فرمایا "ہاں" ! بے شک اس سے زیادہ ہے" بولی" تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارہ نہ کریگی" یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا' پھر سر اٹھا کر فرمایا "خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے' جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے" (سنن نسائی' باب ما یرجی من الرحمۃ)

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں' ایک صحابی چادر میں ایک پرندہ کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں' اور واقعہ عرض کرتے ہیں' کہ "یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا ماں نے یہ دیکھا تو

میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑا کھول دیا تو وہ فوراً آکر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی" ارشاد ہوا "کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے" (مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد باب رحمۃ اللہ)

حسن خاتمہ

ربانی مخانہ کا عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاوداں کا آخری نغمہ خواں عندلیب، نظارہ جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، مستور ازل کے چہرہ زیر نقاب کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری گھنٹوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور ﷺ کی طرف لگی ہیں، نبوت کے آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعتاً لب مبارک وا ہوتے ہیں، تو یہ آواز آتی ہے" "لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، میرا پیارا صرف ایک ہی ہے، وہی جس نے ابراہیم کو اپنا پیارا بنایا، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ مبارک تھا" خداوند! بہترین رفیق (صحیح بخاری وفات)"

یہ سچ ہے کہ اسلام رحمت الٰہی کے ساتھ غضب الٰہی کا بھی معتقد ہے مگر جانتے ہو کہ اسلام کے عقیدہ میں اس کی رحمت و غضب کا باہمی توازن کیا ہے، خدا فرماتا ہے۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری) میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی ہے۔

صلائے عام

اے ربانی عشق و محبت کے طلبگارو! اگر واقعی تمہارے دل فانی محبت سے ہٹ کر کسی باقی کی محبت کے خواہشمند ہیں، اگر در حقیقت تمہیں ازلی و ابدی محبوب کی تلاش ہے، اگر دراصل تمہارا جسم نہیں، بلکہ تمہاری روح کسی کی محبت کی سرشاری کیلئے بیتاب ہے، تو آؤ کہ یہ دولت صرف اسلام کے آستانہ پر ملتی ہے، اور اسی کے خزانہ سے ملتی ہے!

یکم نومبر ۱۹۶۹ء

سنّت

سُنّت

خوشی کی بات ہے کہ کچھ لوگوں میں آج کل مذہبی تحقیقات کا شوق پیدا ہو رہا ہے گو وہ ہمارے نقطۂ نظر سے آج کتنے ہی دور ہوں، مگر بہر حال ان کا یہ شوق اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ انہوں نے اس قسم کی بحثوں میں پڑنا اپنے لئے تضییع وقت نہیں سمجھا گو اس کا افسوس ہے کہ کامل تحقیق سے پہلے اپنے غور و فکر کے نتائج کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کر دینا ممکن ہے کہ بہتوں کی ٹھوکر کا باعث ہو، حق کی اشاعت ضروری ہے لیکن شائع کرنے والے پر اس کی بڑی ذمہ داری آتی ہے کہ وہ پہلے حق کا حق ہونا اچھی طرح سمجھ لے۔

اردو کے ایک ادبی (۱) رسالہ میں ماہ بماہ ایسے مضامین نکل رہے ہیں، جن میں اس قسم کی تحقیقات کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، خصوصاً ایک خاص صاحب (۲) کے مضمون اور بھی زیادہ دلچسپ حقائق کا مجموعہ ہوا کرتے ہیں، جن کا سلسلہ خدا خدا کر کے اب تمام ہوا ہے، میں نے اس سلسلہ مضمون کے بعض ٹکڑوں کو

---

(۱) رسالہ نگار لکھنؤ (۲) نیاز فتح پوری

اس وقت بھی پڑھا تھا' جب وہ پہلے پہل معارف میں چھپنے کی خاطر بھیجے گئے تھے' اور اب بھی دیکھا' پھر موصوف کے خیالات سے اکثر خطوط و مکاتیب کے ذریعے بھی واقفیت ہوتی رہی' مگر ان تمام معلومات کے بعد بھی موصوف کے نظریات میں کوئی خاص اصول مد نظر نہیں معلوم ہوتا' میں نے ایک دفعہ ان کو یا ان کے ایک اور ہم خیال سب جج صاحب کو لکھا تھا۔

گاہ بردل زندوگاہ زند بر ایمان
یارِ زلف تو ندانم کہ چہ در سر دارو

یہی شعر اب بھی پڑھتا ہوں ہمارے دوست نے اسلامی احکام کی ایک طویل فہرست دی ہے' جو قرآن پاک میں مذکور نہیں' اور ان کا ماخذ صرف حدیث ہے' مجھے تو ان میں سے اکثر احکام قرآن پاک میں نظر آتے ہیں۔

اصول فہم قرآن

میں نے ایک سے زائد بار لکھا ہے کہ اس قسم کے مباحث میں جزئی باتوں کی تحقیق میں پڑنا بیکار ہے' ضرورت یہ کہ ان کے اصول کلیہ پر بحث کی جائے جن کے اندر یہ تمام جزئیات داخل ہیں' مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کے مستنبط کرنے کے کیا اصول ہیں؟ ہمارے یہاں اصول فقہ کا بڑا حصہ انہی مباحث کی تفصیل میں ہے' اور اس میں وہ اصول بتائے گئے ہیں' جن کی بنا پر کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کا استنباط کر سکتے ہیں

مثلاً بحث یہ ہے کہ اگر قرآن میں کوئی ایسا لفظ یا محاورہ ہے، جس کے متعدد معنی ہیں، یا جس کے حقیقی معنی یا مجازی معنی مراد ہونے میں شک ہو تو تعیین کیونکر ہو گی، یا یہ کہ اس کے معنی تو معلوم ہوں، لیکن اس کے شمول میں شک ہو کہ کتنے افراد کو یہ شامل ہے، یا یہ بحث ہو کہ یہ حکم مطلق ہے، یا اس کے اندر کوئی استثناء یا تخصیص بھی ہے، یہ اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے معلوم کرنے کے کیا قواعد ہیں؟

پھر یہ کہ ایک عبارت سے مطلب نکالنے کی متعدد صورتیں ہیں، ایک تو صاف صاف لفظوں سے مطلب نکلتا ہے، ایک اس کے عنوان بیان سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے اشارات و کنایات سے کچھ سمجھا جاتا ہے، اس لئے اگر کوئی بات قرآن پاک کے لفظوں میں مذکور نہیں مگر اس کے عنوان بیان اور اشارات و کنایات سے مفہوم ہوتی ہے، تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قرآن میں نہیں۔

کیا جس طرح آج آپ کو قرآن پاک کی آیتوں کے نزول کے ماحول میں سینکڑوں برس کی دوری کے باوجود اس کے متعلق بیسیوں نکتہ آفرینیوں کا حق حاصل ہے، یہ حق خود اس کو حاصل نہ تھا، جس پر یہ قرآن اترا، اور جس کو اس کے تبیین اور تشریح کا حکم تھا؟

تفاوت ذہن

فرض کیجئے کہ آنحضرت ﷺ پر قرآن میں یہ حکم نازل ہوتا ہے کہ "صبح سے شام تک روزہ رکھو" اب ایک شخص آکر پوچھتا ہے، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں نے بھولے سے کھالیا، کیا میرا روزہ صحیح ہوا؟ آپ نے فرمایا ہاں، بھول چوک معاف ہے، روزہ صحیح ہوا، اب سوال یہ ہے کہ آپ نے جو مسئلہ بتایا، اصولاً یہ قرآن کے اندر تو مذکور ہے مگر خاص روزہ کے حکم کے ساتھ مذکور نہیں، تو کیا کہا جائے گا کہ یہ

حکم قرآن کے اندر نہیں اور یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔

لیکن میں دوسری بات کہتا ہوں نہ دنیا میں تمام انسان ایک ہی قابلیت وذہانت اور فہم کے نہیں ہوتے دیکھئے کہ آج آپ کو جو نکتہ آفرینیاں سوجھتی ہیں، وہ نہ پہلے کسی کو سوجھیں اور نہ خود اس زمانہ کے بہت سے آدمیوں کو سوجھتی ہیں، قرآن پاک ہر آدمی پڑھتا ہے مگر ایک صاحبِ علم کو اس کے لفظ لفظ سے جو حقائق و معارف معلوم ہوتے ہیں وہ ایک عام آدمی کو نہیں معلوم ہوتے۔

احادیث سے چارہ نہ تھا

جب یہ مسلم ہے کہ افراد انسانی کی عقلیں متفاوت ہیں، اور ان کے فہم وذہانت کے معیار مختلف ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرت پر قرآن میں ایک حکم نازل ہونے کے بعد اگر وہی یا اس سے بظاہر کسی قدر مختلف کوئی بات پیش آئے، یا کسی صحابی کو یہ شک پیدا ہو کہ یہ واقعہ اس کلی حکم کے تحت میں ہے یا نہیں، تو اب وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کیا صورت اختیار کرتے؟ ظاہر ہے کہ یہی ممکن اور موزوں صورت ہو سکتی تھی کہ وہ صاحب وحی علیہ السلام سے آکر دریافت کرتے، پھر سوال یہ ہے کہ جب وہ آکر پوچھتے تو آنحضرت صلعم کیا کرتے، خاموش رہتے، یا قرآن پاک کی اس آیت کے بقیہ الفاظ کو جن کے سمجھنے یا جس کو اپنی صورت واقعہ پر منطبق کرنے میں، ان کو شبہ پیدا ہو رہا ہے، دہرا دیتے یا یہ کرتے کہ جو گتھی ان کے سامنے تھی، اس کو سلجھا دیتے، اور بات صاف کر دیتے، ظاہر ہے کہ یہی آخر صورت قابل اختیار تھی، اب ایسی حالت میں کیا، ان اصحابی کے لئے یہ ناجائز قرار دیا جاتا کہ اپنی صورت واقعہ کو دربار رسالت میں اپنے سوال کو اور آپ کے جواب کو، کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کرتے، یا اگر کسی دوسرے کو وہی صورت حال پیش آتی، تو اس کو وہی حل نہیں بتاتے، کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس کو ناجائز اور ناروا نہیں کہہ سکتا، یہی صورت حال ہے،

جس کا نام اصطلاح میں "حدیث" ہے۔
اس کو کسی مثال میں دیکھئے تو واضح ہو جائے گا قرآن پاک میں ہے کہ

لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ سورہ مائدہ 5:87

خدا نے تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کی ہیں' اس کو اپنے اوپر حرام نہ کرو'

ایک صحابی آکر پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلعم) میں چاہتا ہوں کہ شادی نہ کروں' بلکہ شادی کا جذبہ جن اسباب سے انسان میں پیدا ہوتا ہے' انہی کو کاٹ ڈالوں' آپ نے فرمایا' یہ جائز نہیں ہے' اس کے بعد قرآن پاک کی آیت مذکور پڑھی' جس تک ان صحابی کی نظر نہیں پہنچی تھی' تو کیا ان اصحابی کے پوچھنے اور آپ کے جواب دینے کے واقعہ کو کسی سے بیان نہ کیا جائے اور اگر کسی تابعی کے ذہن میں وہی سوال پیدا ہوتا ہو تو کسی صحابی کیلئے جائز نہ تھا کہ اس واقعہ کو اس کے سامنے دہرائے اور اس کے شک کو دور کرے' اگر یہ جائز تھا اور ہے تو اسی کا نام روایتِ حدیث ہے'

روایت سے چارہ نہیں'

روایت سے دنیا میں کسی فن' کسی مذہب' کسی حکومت' کسی انسانی کاروبار کو کبھی بھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا' ظاہر ہے کہ ہر انسان' ہر واقعہ' ہر تجربہ' اور ہر حادثہ کے وقت بذات خود موجود نہیں رہ سکتا' ایسی صورت میں غیر موجود اشخاص تک اس واقعہ تجربہ اور حادیث کو پہنچانے کی روایت کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی' خواہ وہ زبانی ہو' یا تحریری ہو' یا ان لوگوں تک جو اس زمانہ کے بعد آئیں' پہنچانے کا ذریعہ روایت کے سوا کوئی دوسرا موجود نہیں ہے' دنیا کے تمام فنون' مسائل' مخترعات' اور

واقعات وحوادث کی نقل اور علم اسی طرح دنیا میں عہد بعہد پہنچا' اور پھیلا ہے' تو پھر کیا اسلام دنیا سے کوئی انوکھا' واقعہ ہے' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وفرامین واقوال کو دوسروں تک یا آئندہ آنے والوں تک پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کیا جاتا۔

آج کے یہ نئے مفسرین اور یہ جدید "بانیان مذاہب" یہ بالفرض اپنی امت کے امام اور مقتدا بن جائیں' تو ان کی ذاتی تحقیقات کاوشیں' نکتہ آفرینیاں ان کی امت کے ان افراد تک جو ان کے حلقہ درس سے دور ہیں' یا آج سے سینکڑوں بعد آئیں گے' پہنچانے کا تحریری یا زبانی روایت کے سوا' اور کیا ذریعہ ہوگا' خصوصاً اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابھی کاغذ کی صنعت بھی اس ملک میں نہیں' لکھنے پڑھنے کا رواج بھی کم ہے' اور ڈاک تار' برقی مشین' پریس' اور چھاپہ کی ایجاد کو ابھی ہزار برس باقی ہیں'

آج دنیا میں بڑی بڑی قوموں کی تاریخیں' بڑے بڑے علماء کے خیالات' پرانے مصنفین کی تصنیفات ہم تک کس طرح پہنچی ہیں' خود قرآن پاک ہم تک کس طرح پہنچا ہے' اسی تحریری یا تقریری روایت کے ذریعہ سے' فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ قرآن پاک ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی روایت ہے' اور احادیث چند انسانوں کی' مگر ایسے انسان جن کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان کا سلسلہ سند ہمارے پاس محفوظ ہے' اس لئے قرآن وحدیث میں جو فرق ہو سکتا ہے' وہ وثوق اور اعتبار کی زیادتی اور کمی کا اور قرآن وحدیث کے درمیان اس نسبت کو ہر مسلمان بلکہ ہر اہل حدیث تسلیم کرتا ہے۔

اس لئے جس طرح دنیا میں عام روایتوں کے صحیح یا غلط ہونے کی تنقید کے

اصول ہیں' وہی حدیث کی بھی تنقید کے اصول ہیں' ہم سے جب کوئی بات کہی جاتی ہے' تو ہم اوس کو کس طرح جانچتے ہیں؟ اسی طرح نہ کہ ہم دیکھتے ہیں' کہ بیان کرنے والا کیسا ہے جس سے بیان کیا تھا' وہ کیسا تھا' جس وقت یہ واقعہ ہوا' وہ اس میں موجود تھا یا نہیں' جس شخص سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے' اس کے عام حالات سے یہ بات لگتی ہوئی ہے یا نہیں' یہی چیزیں ہیں جن کا نام اصول حدیث ہے۔

اسلام کی تاریخ برباد ہو جائے گی

اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے' کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک واقعہ' ایک ایک قول' اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا' اور ان کے لئے متعدد اصول اور فن ایجاد کئے' اگر اسلام کے ان نئے محسنوں کے خیالات مان لئے جائیں' تو یہ کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے لعنت بن جائے گا' اور صحابہ سے لے کر آج تک وتمام اخیار واکابر جو اُمّت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے' وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے' کیا اسلام پر احسان ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لیکر آج تک خلفائے راشدین' تابعین' آئمہ مجتہدین علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور اقوال نبوی کی تقلید واتباع کرتے رہے ہیں' لیکن اگر آج کے اجتہادات مان لئے جائیں تو لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک' انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے' اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں ان کے اقوال واجتہادات واستنباطات کے سننے والے موحد' سچے دیندار اور کتاب اللہ کے سچے پیرو ثابت ہوں گے' اور یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن سخت ناکام رہا' اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا' یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین اسرار پیدا ہوئے جنہوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا اور وہ کام کیا' جو نہ خود رسول نے کیا' نہ ابوبکر صدیقؓ نے کیا نہ عمرؓ فاروق نے کیا' نہ عثمان غنیؓ نے کیا' نہ علی مرتضیٰؓ نے کیا' نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے کیا' اور نہ دوسرے آئمہ مجتہدین سے ہو سکا' اس کے بعد کوئی بتائے کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی' یا نہیں' اگر تھی تو وہ کب' اور اس کی تاریخ کہاں ملے گی' اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفہ آسمانی دنیا میں اور کون ہو گا' کیا کسی مسلمان کی غیرتِ ایمانی اس خیال کو جائز رکھتی ہے؟

احادیث کا کتنا حصہ قابل بحث ہو سکتا ہے

بہر حال آیئے غور کریں کہ احادیث میں کیا کیا ہے' اور اس کے کتنے حصے پر بحث کی جا سکتی ہے' احادیث کا بڑا حصہ در حقیقت تاریخی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے حالات' سوانح' اور واقعات کی روایتیں ہیں' ظاہر ہیں کہ یہ کوئی قابل بحث چیز نہیں' یہ تاریخ کا اسی طرح حصہ ہے' جس طرح دنیا کی اور تاریخیں ہیں' فرق یہ ہے کہ یہ تاریخ کا ایسا مستند و معتبر حصہ ہے' جس سے زیادہ معتبر اور مستند حصہ دنیا میں موجود نہیں' مصر' ہندوستان' بابل' نینویٰ' سیریا' یونان و روم کس ملک اور کس قوم کی تاریخ ہے' جو اس استناد اس اعتبار' اس سلسلہ کے ساتھ محفوظ ہے اور جو تنقید روایت کے اصول پر ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر سکتی ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ اخلاق و حکم کا ہے' جس میں عقل و حکمت کی عمدہ عمدہ باتیں مثلاً جھوٹ کی برائی' عدل کی تعریف' علم کی خوبی وغیرہ بیان کی گئی ہیں' جن کی قرآن

کے علاوہ خود فطرت انسانی تصدیق و تائید کرتی ہے کیا یہ رد کے قابل ہیں؟

۳۔ تیسری چیز عقائد ہیں۔

اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ کے سوا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غالی ظاہریہ ______________ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہو سکتا ہے کیونکہ عقیدہ نام ہے یقین کا، اور یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ وحی اور اس وحی کا تواتر ہے اس لئے عقائد کا مبنی صرف قرآن پاک یا احادیثِ متواترہ ہیں، ظاہر ہے کہ احادیث متواترہ کا مطلق وجود نہیں، یا ایک دو سے زیادہ نہیں، ایسی حالت میں عام احادیث عقائد کا مبنی نہیں قرار پا سکتی ہیں، عموماً احادیث روایتِ احاد ہیں، اور ان کا ایک حصہ مستفیض ہے یعنی صحابہ کے بعد ان کے راویوں کی کثرت ہوئی ہے، اس لئے یہ روایتیں صرف قرآن پاک کی آیات کی تائید میں کام آسکتی ہیں، مستقلاً اون سے عقائد کا ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ اب رہ گئے احکام، ان کے لئے مستفیض و احاد سب کچھ کار آمد ہیں، دنیا میں تمام عملی کاروبار اسی پر چل رہا ہے، ایک آدمی تنہا آپ کو آکر اطلاع دیتا ہے کہ فلاں شخص آپ کو بلاتا ہے آپ بے چون و چرا اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں، کبھی سوال وجواب نہیں کرتے کہ اس نے بلایا بھی ہے، یا نہیں، ہاں اگر کسی قرینہ سے شک ہوتا ہے، تو سوال وجواب کر لیتے ہیں، یہی سب صورتیں احادیث میں بھی جاری ہیں، مثلاً اگر کوئی حدیث کسی دوسری زیادہ معتبر روایت کے خلاف ہو، قرآن کے خلاف ہو، یا اور کوئی بات اس کے مخالف نظر آئے، تو ایسے موقع پر یقیناً صاحب تحقیق کو حق ہے کہ اس پر بحث کرے۔

احادیث قرآن سے ماخوذ ہیں؟

بہت سے علمائے محققین کی طرح میرا بھی یہ اعتقاد ہے کہ احکام واخلاق کے متعلق صحیح احادیث میں جو کچھ ہے' وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہے اور چونکہ وہ خود صاحبِ وحی کا بتائید الٰہی وبشرحِ ربانی استنباط ہے اس لئے بشرط ثبوت وہ بھی یقینی اور واجب التعمیل ہے' قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام "تبیین" کھولنا' اور "اراءت" دکھانا ہے' اس موقع پر ہم کو بے شک یہ گلہ ہے کہ ہمارے علماء اور خصوصاً علمائے متاخرین نے اس حیثیت سے قرآن پاک کی خدمت کم کی' حالانکہ صحابہ اور آئمہ مجتہدین نے اپنے اجتہادات اور استنباطات میں ہمیشہ قرآن کو سب سے اول پیش نظر رکھا' لیکن انہوں نے فن کی حیثیت سے اس کو مستقل نہیں کیا' ان کا زمانہ تدوین فن کا نہ تھا یہ بعد کے لوگوں کا کام تھا' اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جس طرح کتبِ فتاوی کی سہولت نے لوگوں کو فقہ سے اور کتبِ فقہ کی سہولت نے حدیث سے باز رکھا' اسی طرح حدیث کی سہولت اور ابواب کی تقسیم نے لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع کرنے سے باز رکھا کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ الگ الگ عنوانوں اور بابوں میں درج نہیں' اس لئے لوگوں کو تلاش میں دقت ہوتی ہے' پھر قرآن سے استنباط کر لینا ہر عامی کا کام نہیں' علماء میں سے جنہوں نے احکام القرآن پر کتابیں لکھیں' انہوں نے بھی تفسیری ترتیب کو چھوڑ کر فقہی ترتیب کو اختیار نہیں کیا' جس کی وجہ سے جو مشکل لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع ہونے سے پہلے پیش آتی تھی' وہ پھر باقی رہی' بہر حال ضرورت ہے کہ ان عقائد القرآن اور اخلاق القرآن پر ہمارے علماء مفصل کتابیں لکھیں' آج بھی جو لوگ قرآن پاک کے ساتھ شغف کا اظہار کر رہے ہیں' اور قرآن ہی کو صرف حجت جانتے ہیں' وہ بجائے اپنے موجودہ طرز عمل کے قرآن واحادیث کے باہمی تعلق وارتباط پر اس نظریہ کو سامنے رکھ کر کام کرتے' تو اسلام

کے لئے کتنا بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیتے' مگر افسوس ہے کہ اس کے بجائے اور بھی تفریق وانتشار کا باعث ہو گا' جس کی مثالیں چند ہی سال میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں نظر آتی ہیں۔

بہر حال اس غلط طریقہ کے سوا ایک اور غلط مبحث بھی ہو رہا ہے۔

حدیث و سنت میں فرق

آج کل لوگ عام طور سے حدیث و سنت میں فرق نہیں کرتے' اور اس کی وجہ سے بڑا مغالطہ پیش آتا ہے' حدیث تو ہر اس روایت کا نام ہے' جو ذات نبوی کے تعلق سے بیان کی جائے' خواہ وہ ایک ہی دفعہ کا واقعہ ہو یا ایک ہی شخص نے بیان کیا ہو' مگر سنت دراصل عملِ متواتر کا نام ہے' یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمل فرمایا' آپ کے بعد صحابہ نے کیا' پھر تابعین نے کیا' گو یہ زبانی روایت کی حیثیت سے متواتر نہیں' مگر عملاً متواتر ہے' اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک واقعہ روایت کی حیثیت سے مختلف طریقہ سے بیان کیا گیا ہو' اسلئے وہ متواتر نہ ہو مگر اس کی عام عملی کیفیت متواتر ہو' اس متواتر عملی کیفیت کا نام سنت ہے۔

فرض کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی فرضیت کے بعد تمام عمر دن میں پانچ دفعہ پڑھتے رہے' آپ بعد تمام صحابہ کا یہی طرز عمل رہا' یہی تابعین کا رہا' اور یہی روئے زمین کے تمام مسلمانوں کا رہا' ان کا بھی جو بخاری و مسلم کے وجود سے پہلے تھے' اور ان کا بھی جو اس کے بعد پیدا ہوئے' تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پانچ وقت کی نماز اصطلاحی روایت متوارہ سے ثابت ہو یا نہ ہو' لیکن عمل متواترہ سے بلا شک وشبہ ثابت ہے' تیرہ سو برس زائد سے آج تمام دنیا کے مسلمان جن کے عقائد' اعمال' خیالات' اخلاق' زبان' تمدن' وطنیت اور زمانہ میں بے حد اختلاف اور تفاوت ہے' تاہم اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم اور آپ کے اصحاب دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھا کرتے تھے' فلاں فلاں اوقات میں پڑھا کرتے تھے' اور فلاں فلاں ارکان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے' یہ تواتر عملی ہے' جس کا انکار مکابرہ ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان پانچ اوقات کا تعین اور اس طرح طریقہ نماز بخاری یا مسلم یا ابو حنیفہ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہم کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پذیر ہے۔ یہ وہ عملیت ہے جو اگر بخاری یا مسلم دنیا میں نہ بھی ہوتے تو بھی وہ اسی طرح عملاً ثابت ہوتی' اگر دنیا میں بالفرض احادیث کا ایک صفحہ بھی نہ ہوتا تو بھی وہ اسی طرح جاری رہتی' احادیث کی تحریر و تدوین نے اس طرز عمل کی ناقابل انکار تاریخی حیثیت مثبت کر دی ہے' تو کیا پھر اس بنا پر کہ اس عملی کیفیت کو دوسری یا تیسری صدی کے کسی محدّث نے الفاظ و تحریر میں قلم بند کر دیا' وہ تواتر حد اعتبار سے گر گیا؟

عملی روایت میں اختلاف

اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض عملی روایات میں بھی تو اختلاف ہے' روایتوں میں ہے کہ آپ یا صحابہؓ رفع یدین کرتے تھے' بعض میں ہے کہ نہیں کرتے تھے' بعض میں ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے' دوسری روایت میں ہے کہ ناف پر ہاتھ باندھتے تھے' ایک میں ہے کہ آمین زور سے کہتے تھے' دوسری میں ہے کہ آہستہ کہتے تھے' آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں عملاً کیونکر درست ہو سکتے ہیں' میرا جواب یہ ہے کہ اس مشکل کے حل کی بھی وہی تدبیر ہے جو دنیا کے دوسرے روایتی واقعات کے حل میں اختیار کرتے ہیں اگر آپ کے سامنے کسی نادیدہ واقعہ کے متعلق دو قسم کی مختلف روایتیں آتی ہیں' تو آپ کیونکر فیصلہ کرتے ہیں؟ یہی کرتے ہیں کہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں بیان کرنے والوں میں سے کون زیادہ معتبر اور ثقہ ہے؟ یا کس کا بیان

دوسرے یقینی حالات وواقعات سے زیادہ قرین قیاس ہے یہی صورت ان احادیث میں بھی ہے' جتنا حصہ ان عملی روایات کا ایسا ہے جو بلا ادنیٰ اختلاف ثابت ہے' وہ یقینی اور ناقابل رد ہے' اور جتنا حصہ مختلف فیہ ہے اگر ان مختلف پہلوؤں میں کوئی ایک پہلو اصولاً اور قیاساً زیادہ معتبر ہے اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اگر سب پہلو برابر ہیں' تو یہ مان لینا چاہیے کہ ان مختلف طریقوں میں جس طرح بھی کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے۔

فرض کیجئے نماز کے متعلق پانچ اوقات کے عمومی تعین' نمازوں کی تعداد' نمازوں کی عام ہئیت یعنی قیام' رُکوع' سجود' اور بحالت قیام قرآن پڑھنے میں اور دوسرے ارکان میں تسبیح و تہلیل کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے' اس لئے یہ عملی متواتر ہے اور اس میں کوئی شبہہ اور شک نہیں کیا جاسکتا' لیکن یہ بات کہ رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے' آمین زور سے کہی جائے' یا آہستہ' دو وقت کی نماز ایک وقت میں کب اور کہاں پڑھی جاسکتی ہے' اُن کے متعلق اگر اختلاف ہے تو تحقیق کرنی چاہیے کہ ان میں سے غالب پہلو کس طرف ہے' اگر آپ کو اس کا پتہ لگ سکے' تو اس کو اختیار کیجئے ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ دونوں طرح سے جائز ہے' اور ان میں سے جو پہلو بھی کوئی اختیار کرے اس پر ملامت نہیں ہے

سنت کی حقیقت

اس تفریق سے معلوم ہو گیا کہ سنت اور حدیث میں عظیم الشان فرق ہے حدیث محض روایت کی حیثیت کا اور سنت اس کے عملی تواتر کا نام ہے' احادیث کو چھوڑ کر قرآن پاک کی بھی یہی صورت ہے قرآن پاک کا حکم ہے کہ نماز پڑھو "اقیمُوا الصّلٰوۃ" اور اس کی تفصیلات بھی جابجا بتادیں' انہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر بتادیا اور فرمایا" صلّوا کمارایتمونی" اس طرح نماز پڑھو' جس طرح تم نے مجھے پڑھتے دیکھا' آنحضرت ﷺ تمام عمر' اسی

طرح پڑھتے رہے' قرآن پاک کے الفاظ کی جو عملی تصویر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی' وہی سنت ہے' اور یہ گویا قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے' جس کا مرتبہ احادیث کے لفظی روایات سے بدرجہا بلند ہے' سنت کے علاوہ اسی مفہوم کے لئے قرآن پاک آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے دوسرے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے مثلاً سبیل اور اسوہ وغیرہ' مگر ان سب کے معنی چلے ہوئے راستہ اور پیروی کے ہیں' یعنی وہ راستہ جس پر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھی چلے تمام صحابہ چلے اور اکابر امت چلے' وہ سنت ہے' سبیل ہے' طریق ہے' اور اسوہ ہے' اور یہی وہ مفہوم ہے جس کے لئے امام مالک نے موطا کا لفظ ایجاد کیا' اور اپنے مجموعہ روایات کا نام رکھا' موطا کے لفظی معنی پامال اور روندنے کے ہیں' یعنی وہ پامال اور روندا ہوا راستہ جس پر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ گذرے یہی راستہ عملی اسلام کا ہے اور وہی قرآن کی صحیح عملی تفسیر ہے۔

کتاب و سنت

احادیث میں اکثر کتاب و سنت کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے خصوصاً آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبوں میں ہے کہ "تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں" "کتاب اللہ اور اپنی سنت" اس حدیث کی تشریح میں سنت سے مقصود ہر لفظی روایت اور عن عن کی حدیث نہیں ہے' بلکہ آپ کا عمل متواتر اور موطا طریق ہے' جو قرآن پاک کی صحیح تفسیر و تشریح ہے'

سنت اور بدعت

آپ نے دیکھا کہ سنت کی حقیقت کیا ہے اور احادیث میں جس سنت کے اتباع کی بار بار تاکید آئی ہے' وہ کیا چیز ہے اور "علیکم بسنتی" میرا طریقہ اختیار کرو'

بعض امور کے متعلق من سُنتی میرا طریقہ کہنا' بعض چیزوں کے متعلق اصبت السّنۃ تم نے سنت کو پالیا کہنے کا کیا مفہوم ہے'

اسی سنت کا مقابل بدعت ہے' جس کے معنی نئی بات کے ہیں' اور ہمیشہ سنت اور بدعت یہ دونوں لفظ مقابل اور ضدین کی حیثیت سے بولے جاتے ہیں' کیونکہ سنت کے معنی ہیں وہ طور طریق جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا' اور بدعت کے معنی ہیں اس کو چھوڑ کر اور اس سے الگ ہو کر اپنے لئے کوئی نئی راہ عمل اختیار کرنا' اسی لئے پہلی چیز ہدایت اور دوسری ضلالت ہے۔

کیا سنت عبرانی لفظ ہے؟

اردو کے اسی سابق الذکر رسالہ میں اسی سابق الذکر مضمون نگار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سنت کا لفظ عبرانی "مسناۃ" سے نکالا ہے' یہودیوں نے توراۃ کو چھوڑ کر اس قسم کے مجموعہ روایت کو اپنا ماخذ بنالیا تھا' جس کو وہ مسناۃ کہتے تھے' اسی طرح مسلمانوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو اپنا ماخذ بنایا ہے' اس کا نام بھی اسی لفظ مسناۃ سے لیکر سنت بنالیا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ تحقیق انیق ہر قسم کے اندرونی وبیرونی اسلامی وافرنگی' عربی' وعبرانی تحقیقات کی ٹکسال سے باہر ہے' اور ایسا دعویٰ کرنا اہل علم کی نگاہوں میں اپنی حقیقت کو عریاں پیش کرنا ہے۔

عبرانی لفظ مسناۃ "س" سے نہیں ہے' بلکہ "ش" سے ہے' یعنی مشناۃ جو عربی میں مثنیٰ اور اثنین اور مثنیہ کی صورت میں ہے' اس کے لفظی معنی دو کے ہیں' اور یا مکرر اور دہرائے ہوئے کے ہیں' مشناۃ تورات کی پانچویں کتاب کا نام ہے' جس کو آج کل عربی میں "مثنیہ" کہتے ہیں' اور غلطی سے اس کا ترجمہ استثناء کر دیا گیا ہے

انگریزی میں اس کا ترجمہ ڈیوٹرونومی ہے' جس کے لفظی معنی وہی مثنی اور مکرر کے ہیں' توراۃ کے وہ وہ قوانین جو پچھلی کتابوں میں مذکور ہیں' اس کتاب میں ان کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ مرتب اور مدون کر کے پیش کیا گیا ہے' اس لئے اس کا نام مثناہ مثنیہ' یا مثنی اور مکرر کہا گیا' خود قرآن پاک نے اپنے اوپر مثناۃ کی جمع مثانی کا اطلاق متعدد آیتوں میں کیا ہے' غور کیجئے کہ اس مثناۃ کے لفظ کو سنت سے کیا تعلق ہے' مثناۃ کوئی ایسا لفظ نہیں جو علمائے سلف اور لغویین عرب کو معلوم نہ ہو' لسان العرب' صحاح جوہری، مجمع البحار' فتنی سب میں یہ لفظی مثنی کے تحت میں مذکور ہے' اور اس کے معنی لکھے ہیں اور اس پر تھوڑی سی بحث کی ہے' سنت خالص عربی زبان کا لفظ ہے' اس کے لفظی معنی راستے کے ہیں' لیکن بول چال میں اس کے معنی' اس طریقہ عمل کے ہیں جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے قران پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے۔

قد مَضَتّ سُنة الاوّلین' (انفال) 8:38	گذشتہ قوموں کا طریق عمل گذر چکا ہے
الا انُ تاتیھِمُ سنة الاوّلین (کھف) 18:55	لیکن یہ کہ گذشتہ قوموں کا طریق عمل ان کے ساتھ برتا جائے'
سنة مـن قـد ارسلنا قبلك 8.77 (اسرائیل)	ان لوگوں کا طریقہ عمل جن کو ہم نے تم سے پہلے رسول بنایا'

سنۃ اللہ کا لفظ قرآن مجید میں اس معنی میں کئی دفعہ آیا ہے

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً ، خدا کے طریقِ عمل میں تم تبدیلی نہ پاؤ گے ،
48:23 (سورۃ فتح)
33: 62 (سورۃ احزاب)

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً خدا کے طریقِ عمل میں تم تغیر نہ پاؤں گے ،
35:43 (فاطر)

کیا اس سے بھی زیادہ ہم کو اپنی شہادت کیلئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

سنت اور بدعت کا معیار

مسلمانوں میں اختلاف کا آغاز قرن اول ہی سے ہو گیا تھا، لیکن غور سے دیکھئے کہ یہ اختلاف زیادہ تر نظریات و آراء کا تھا، جن کو عمل سے تعلق نہ تھا، کیونکہ غیر مادی، غیر محسوس امور کے متعلق کوئی محسوس و مادی عملی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی تھی، مثلاً یہ کہ خلافت مسلمانوں کے مشورے سے ہے، یا نص الٰہی سے ہے، یہ شیعہ اور اہل سنت کے درمیان سب سے اہم بحث ہے، یا یہ کہ قیامت میں دیدار الٰہی ان ظاہری آنکھوں سے ہوگا، یا نہیں؟ یہ ایک معرکۃ الآراء، اختلافی بحث معتزلہ اور اشاعرہ وماتریدیہ کے درمیان میں ہے، لیکن یہ تمام اختلافات نظریاتی حیثیت رکھتے ہیں، ان مسائل میں جن کی حیثیت عملی، مادی اور محسوس تھی، مسلمانوں میں کوئی بڑا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر عملی سنت سب کے پیش نظر تھی، اور یہ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز تھا، رفع یدین، آمین بالجہر، وضع ید علی الصدر، قراءت فاتحہ خلف الامام کی بحث اگر فریقین کا غلو اور تعصب علیحدہ کر دیا جائے تو یہ صرف افضلیت کی بحث رہ جاتی ہے جو زیادہ اہم نہیں۔

یہ ہر مذہب کا اصول کلی ہے، خصوصاً اسلام کا اور فطرتاً ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے کہ

ہر مذہب کا بہترین عہد اور دور وہ ہوتا ہے' جو خود صاحب مذہب کا مبارک زمانہ ہوتا ہے' اس کے بعد اس کے جانشینوں اور صحبت یافتوں کا' پھر رفتہ رفتہ اس میں ضعف ہوتا جاتا ہے' اور اس کے مذہب کا قوام بگڑتا جاتا ہے' اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اصل مذہب نہیں' بلکہ وہ ہے' قرآن کا یہ حکم نہیں' بلکہ وہ ہے تو اس کا فرض ہے کہ رسول کے مبارک عہد میں جو طرز عمل اس کو نظر آتا ہے' اس کو اصل مذہب کا معیار قرار دے' اور جو چیز اس عہد میں نظر نہیں آتی' اور بعد کو وہ شامل ہو جاتی ہے' اس کو مذہب سے خارج یعنی بدعت قرار دے' اس اصول کی بنا پر جو بالکل واضح ہے' ہر اوس شخص کا جو اسلام کے اصلی پیکر کی جلوہ آرائی کا مدعی ہے اور قرآن کی صحیح تعلیم کو آج دنیا میں پیش کرنا چاہتا ہے' یہ فرض ہے کہ وہ اس اصلیت اور اس صحیح تعلیم کے خدوخال اس عہد مبارک کی عملی زندگی میں دکھائے' اور یہ بتائے کہ آج جو غلطیاں اس کو نظر آتی ہیں' وہ اس وقت نہ تھیں' بلکہ بعد کو اسلام میں داخل ہو گئی ہیں' مثلاً یہ بتائے کہ اس عہد مبارک میں صرف دو وقت یا تین وقت کی نماز تھی' بعد کو بخاری و مسلم وابو داؤد مرتب ہوئیں تو مسلمانوں میں پانچ وقتوں کی نماز کا رواج ہوا' پہلے اس طرح نماز پڑھی جاتی تھی' بعد کو اس میں فقہاء اور محدثین نے یہ اضافہ کر دیا' اگر یہ ثابت نہیں ہو سکتا' اور یقیناً ثابت نہیں ہو سکتا' تو یہی ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) اپنے زمانہ میں اپنی وحی کے سمجھنے میں غلطی کی' اور اب اس کو ہندوستان کے عجمی اپنی معمولی صرفی و نحوی لیاقت سے درست کر رہے ہیں' کیا کوئی مسلمان بلکہ انسان بھی ایسا احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے؟

معارف اگست ۱۹۲۹

پھر بحث سنت

کچھ اور اختراعات والزامات

(۱)

دوستوں کو یاد ہو گا کہ اگست ۲۹ء کے معارف میں ایک صاحب (۱) کے جواب میں "سنت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا جس میں مدعی مذکور کے اس خیال کی تردید کی گئی تھی کہ سنت اور زبانی روایات یا حدیث ایک چیز ہیں' اور اس کے اس اختراع کی غلطی ظاہر کی گئی تھی کہ مسلمانوں کا لفظ سنت "یہودیوں" کے لفظ "مسناۃ" سے ماخوذ ہے' جو یہودیوں کے ان زبانی روایات کے مجموعہ کا نام ہے' جو سنہ عیسوی سے پس و پیش زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد مرتب ہوا تھا۔

اسی مضمون سنت کے چھپنے کے بعد مدعی مذکور نے پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے سوال و جواب کیا' اور اس کے بعد ایک طویل مضمون اپنے مدعا کے اثبات اور

(۱) نیاز فتح پوری

میری تردید میں چھپوایا' جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے' اس کے جواب میں انشاء اللہ کوتاہی نہ ہوگی' لیکن موصوف کے مضمون کے لب ولہجہ اور طرز وانداز کے جواب کی توقع کم از کم معارف میں نہ رکھنی چاہیے۔

مجھے یہ ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ معارف کے اس مضمون سنت کو اللہ تعالٰی نے توقع سے زیادہ کامیابی بخشی' موافقین کے علاوہ بعض مذبذب دوستوں کے شکوک بھی اس سے دور ہوئے'

مگر افسوس ہے کہ اصل مخاطب کو اس سے تشفی نہیں ہوئی' بلکہ اپنی غلطی یا غلط فہمی پر ان کا اصرار اور بڑھ گیا' موصوف کو میرے انگریزی نہ جاننے پر تاسف ہے' یہ تاسف مجھے خود بھی ہے' مگر ان کی تسلی کے لئے بطور اظہار واقعہ یہ امر ان پر ظاہر کر دینا ہے کہ ان کی آرزو کے مطابق میں کم از کم اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ انسائیکلو پیڈیا کے تاریخی ومذہبی مضامین پڑھ اور سمجھ سکوں' انہیں اس کا اطمینان رکھنا چاہیے' اور یہ بات ان کو میری اس تصنیف (ارض القرآن) کو پڑھ کر سمجھ لینی چاہیے تھی' جس کی ابھی انہوں نے اپنے والانامہ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء میں تعریف وتوصیف کی ہے' اور اپنے مضامین میں اس سے سرقہ کا "مخلوت" اعتراف بجا کیا ہے' اور ناظرین بھی ان کے مضامین " قرآن مجید وآثار قدیمہ "اسلامک ریویو اور اشاعت اسلام میں دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

مضمون زیر بحث میں دو قسم کی بحثیں ہیں' ایک لفظی اور دوسری معنوی دونوں بحثوں کو علیحدہ کر دینا ہے' تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے۔

مسنات اور سنت

لفظی بحث یہ ہے کہ ہمارے دوست کا دعوٰی ہے کہ یہود اپنی زبانی روایات کو" مسناۃ "اور مسلمان اپنی زبانی روایات کو" سنت "کہتے ہیں' مسلمانوں کا یہ عربی لفظ

"سنت" یہودیوں کے عبرانی لفظ "مسناۃ" سے ماخوذ ہے' دونوں بالکل ایک لفظ ہیں' اور ہم معنی ہیں۔

میں نے اگست ۲۹ء کے معارف میں مدعی کی اس تحقیق سے اختلاف کیا' اور ثابت کیا کہ اولاً عبرانی لفظ "مسناۃ" "س" سے نہیں بلکہ "ش" سے ہے' یعنی "شناۃ" اور دوم' اس کے معنی عبرانی میں دوسرے' دوہرانے اور اعادہ و تکرار کے ہیں' ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا اطلاق موسیٰ کی پانچویں کتاب پر ہوتا ہے' جس کو یونانی ڈیٹرونومی کہتے ہیں جس کے معنی دوسرے اور دوسرے قانون کے ہیں' اور عبرانی میں اس کو شنا کہا جاتا ہے اور عبرانی میں شناۃ کہتے ہیں' اور آج کل تثنیۃ الاشتراع (دوبارہ قانون سازی) کہتے ہیں اور ان سب کا ماخذ عبرانی میں "شنا" اور عربی میں "ثنی" اور ان دونوں کے معنوں میں دونوں زبانوں میں دو' دوم اور دوہرانے کا مفہوم ہے اور سنت خالص عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے ہیں' اور اصطلاح میں اس کے معنی وہ طریق ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر قائم رہے' اس کے معنی زبانی روایات کے نہ لغوی ہیں نہ اصطلاحی' اس لئے عبرانی "شناۃ" اور عربی سنت میں کوئی باہم مشارکت و مماثلت نہیں اور نہ عربی سنت عبرانی شناۃ سے ماخوذ ہے۔

ہمارے مخاطب اول نے اس مضمون کو پڑھ کر 5 دسمبر 1929ء کو مجھے خط لکھا کہ "تمہاری تحقیق غلط ہے' ڈوٹرونومی کے لئے مسنا (س) لفظ ہے' اور شنا بالکل جدگانہ لفظ ہے" "میں" ایک سے زائد یہودی معلمین سے اس لفظ کی تحقیقات کر چکا ہوں' اور اس کی تائید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے بھی مل سکے گی'

"اگر اس کے معنی آپ سنت سے علیحدہ دکھائیں تو میں ہار مان لوں"

میں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اس کا مطلب یہ تھا کہ شنا توراۃ کی پانچویں کتاب پر بھی اطلاق کیا گیا ہے' اور تالمود کے ایک حصہ کا نام بھی ہے' یہ کوئی اہم

نقطہ اختلاف نہیں ہے بلکہ اصل چیز "مثنا" کے معنی ہیں' ساتھ ہی میں نے اطلاع دی کہ "مثنا" کے معنی تعلیم اور سکھانے کے بھی ہیں' انہوں نے اس کے ماننے سے بھی انکار کیا' اور لکھا کہ تم کو تالمود کے معنی سے دھوکا ہوا ہے' جس کے معنی واقعاً تعلیم اور سکھانے کے ہیں' اب اس تازہ مضمون میں ہمارے دوست نے پھر اپنی پرانی تحقیق کو بہت فخر وناز کے ساتھ دہرایا ہے' مگر صرف دہرایا ہی ہے' کوئی دلیل یا حوالہ نہیں درج فرمایا ہے۔

اب نقطہ اختلاف دو ہیں۔

1- کیا تورات کی پانچویں کتاب کو بھی عبرانی زبان میں مثناہ لتے ہیں۔

2- کیا سنت اور مثنا ایک ہیں۔

مثنا توراۃ

تورات کی پانچویں کتاب کو میرے "مثنا" کہنے پر مدعی نے مضحکہ اڑایا ہے اور فرمایا ہے کہ "ایک یہودی بچہ بھی اس کو سن کر ہنس دے گا" مگر میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ تحقیق کا راستہ مضحکہ سے ہمراحل دور ہے' توراۃ کی پانچویں کتاب کا نام "قانون ثانی" اس لئے رکھا گیا ہے کہ قانون اول کے بعد دریائے اردن کے اس پار حضرت موسیٰؑ نے اس کو دوبارہ بیان کیا' جیسا کہ اس کتاب کے آغاز میں تحریر ہے' اس کا عبرانی نام "الوہی دہران" بھی ہے' مگر بعد کو شاید مصر کے ترجمہ سبعینی کے وقت سے اس کا نام "مثنا توراۃ" مشہور ہو گیا' جس کے معنی "قانون دوم" کے ہیں' اسی لئے یونانی اور اس سے یورپ کی زبانوں میں اس کا نام "ڈیوٹرونومی" یعنی دوسرا قانون پڑا' اور اسی لئے پرانی عربی میں "مثناۃ" اور نئی عربی میں اس کا نام تثنیۃ الاشتراع ہے' یعنی "دوبارہ قانون بنانا" بہر حال ان سب کے معنوں میں دو' دوم' اور دہرانے کا مفہوم

داخل ہے، جس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ توراۃ کی اس کتاب کے لئے جس شنا کا لفظ بولا جاتا ہے وہ "ش" سے ہے "س" یا "ث" سے نہیں، جیسا کہ مدعی کا دعویٰ ہے، کیونکہ دو اور دوم کے لئے جو عبرانی مادہ ہے وہ "ثنا" ہے۔

حوالوں کے لئے سب سے پہلے "ڈکشنری آف بائبل" (مرتبہ جیمس ہسٹینگز وغیرہ) جلد اول ص 596 مطبوعہ 1900ء ملاحظہ فرمایئے، جس میں لکھا ہے کہ اس کا نام ڈیلوٹرونومی عبرانی الفاظ "مشنا توراۃ" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی نسخہ ثانیہ کے ہیں، اس کے بعد انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبٹر انٹر نیشنل میں لفظ ڈیوٹرونومی دیکھئے اس میں ہے۔

"ڈیوٹرونومی اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ یہ موسیٰ کے قانون کا دہراؤ (یا اعادہ ہے) اب عبرانی لغت میں دیکھ لیجئے کہ دہرانے اور دوسرے اور دوبارہ کرنے کے لئے لفظ شنا ہے سنا یا ثنی یا ثنہ نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے محقق دوست ہم کو باور کرانا چاہتے ہیں، جیسا کہ آگے بتفصیل معلوم ہو گا۔

میرے مضمون سنت کی اشاعت کے بعد موصوف نے 5 دسمبر 1929ء کو جو خط مجھے لکھا تھا اس میں ارقام فرماتے ہیں۔

"ثنہ جس کے معنی ڈوٹرونومی کے صحیح لئے ہیں، وہ ثنا سے بالکل جدا لفظ ہے، اور اس کا تلفظ مِسنا ہے"

اب موصوف اپنے تازہ مضمون میں ڈوٹرونومی کے لئے ہم کو لفظ ثنی دیتے ہیں،

ع کہے یہ حکم رہے کہئے وہ ارشاد رہے

اگر آپ کے کہنے سے توراۃ پنجم کے لئے مسنا صحیح مانا جائے تو تالمود کے لئے بھی تو آپ نے مسنا اور مسناۃ ہی تلفظ پہلے مضمون میں لکھا ہے، اب یہ التباس کیونکر دور ہو گا۔

آپ میرے قول کی تکذیب کے لئے توراۃ پنجم اور حصہ تالمود دونوں کے درمیان فرق مسنا اور مشنا یا مشنہ یا مثنی کہہ کر لاکھ پیدا کیجئے' سب محکمہ تحقیق کے سامنے رد ہو جائے گا' دونوں لفظ قرشت والی "ش" منقوط سے ہیں' اس غیر منقوط یا ث منقوط سے ان میں کوئی لفظ نہیں پڑتا اور ث کا حرف تو عبرانی میں سرے سے موجود ہی نہیں' اس لئے مثنہ یا مثنی تو عبرانی میں ہو ہی نہیں سکتا۔

اب ہمارے دوست غور فرمائیں کہ کس کی تحقیق پر "ایک یہودی بچہ بھی ہنس دے گا" درسفالین کاسئہ رنداں بخواری منگرید۔

کایں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

مثنا' مسنا اور سنت

بہر حال یہ مسئلہ کہ مشنا تالمود مراد ہے' یا مشنا توراۃ ایک ضمنی بحث ہے' اصل سوال یہ ہے کہ کیا عبرانی "مسناہ" اور عربی سنت ایک چیز ہے۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے محقق دوست کی ایک دلچسپ لفظی تحریف کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں' اصل عبرانی لفظ مشنا (ش منقوط) ہے جیسا کہ میرے ٹوکنے پر اب اس دوسرے مضمون میں انہوں نے استعمال کیا ہے' مگر پہلے مضمون میں اس کا عبرانی تلفظ "مسناۃ" بتایا تھا اور یہ اس غرض سے تاکہ سنت اور مسناۃ میں س "ن" اور "ۃ" کا اشتراک ہو جائے اور یہ دعویٰ بآسانی ثابت ہو جائے کہ سنت اور مسناۃ ایک ہیں' اور اب جب انہیں معلوم ہوا کہ عبرانی کا حرف شناس ان کے سوا کوئی اور بھی ہے' تو مجبوراً اس کے لئے دوسرے مضمون میں (مشناس) منقوط سے بولے' یا للعجب!

میں نے اپنے سنت والے مضمون میں یہ دکھایا تھا' اور پھر باعلان دعویٰ کرتا ہوں کہ سنت اور مشنا میں کوئی لفظی یا معنوی مناسبت نہیں ہے' مشنا کے معنی اگر بقول ان

کے زبانی روایات کے ہیں' تو سنت کے معنی عربی میں طریق و روش اور راستے کے ہیں قرآن میں سنت کا لفظ انہی معنوں میں بار بار آیا ہے احادیث میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے' اور لغت اور اشعار عرب میں بھی ان ہی معنوں میں یہ لفظ بولا گیا ہے' قرآن پاک میں ہے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّة اللّٰه تحویْلاً' کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم خدا کی "زبانی روایتوں" میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے' یا یہ معنی ہیں کہ تم خدا کے طریق اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے؟

احادیث میں ہے من سنّ سُنّةً حسنة فَلَه' اَجرَها' کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی اچھی "زبانی روایت" کرے گا تو اس کو اس قسم کی نیکیاں ملیں گی' یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ راستہ یا طریقہ نکالے گا تو اس کو بھی اس کی نیکیاں ملتی رہیں گی'

مشہور حدیث ہے اِلنّکاحُ مِنْ سُنَّتِیْ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ نکاح

میری زبانی روایت ہے یا یہ معنی ہیں کہ نکاح میرا طریقہ ہے' اشعار عرب میں ہے۔

وَاَن الائی بالطف مِن اٰل ھاشم   تاسوا فسنوا للکرام التّا سیا

(آل ہاشم وہ جو طف میں ہیں' انہوں نے باہم غمخواری کی' تو غم خواری کو شریفوں کا طریقہ بنا دیا

"سنو" کے معنی یہاں عملی طریق و روش و طرز عمل کے ہیں' یا زبانی روایت کے' زبانی روایت کے معنی ہو بھی سکتے ہیں اور بن بھی سکتے ہیں ا؟

یہ تو عربی زبان کی تحقیق ہوئی' اب آیئے عبرانی زبان کی خانہ تلاشی کی

جائے ""مشنا" کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں؟ اس بارے میں میں نے پہلے جو لکھا تھا اس کو دہرا دیتا ہوں کہ یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں ثنیٰ' مثنیہ' ثنی وغیرہ کی صورت میں ہے' اور اس کے معنی دہرانے دوبارہ کرنے' اور دوسرا ہونے کے ہیں' مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ اس کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں' میں سوا اس کے اور کیا کہوں۔

صیاد نئی ولا تو نخچیر مکن   چیزے کہ نخواندۂ تو تفسیر مکن

ان کی تشفی کے لئے ان کے حسب مشورہ میں سب سے پہلے یورپ کے علمی صحیفہ کو پیش کرتا ہوں جس پر' ان کا ایمان شاید تمام دوسرے مشرقی صحیفوں سے زیادہ ہو انسائیکلو پیڈیا طبع یازدہم کے مضمون تالمود کے شروع میں (جلد 26' صفحہ 380) ہے۔

"تالمود (عبرانی میں: سیکھنا سکھانا) مشتمل ہے' مشنا پر (عبرانی میں (زبانی) دہرانا

پھر اسی کتاب کے اسی ایڈیشن (یازدہم) کی جلد 13 صفحہ 107 مضمون ہیرو (عبرانی) کے ضمن میں ہے۔

"مشنا کا نام عبرانی لفظ "شنا" سے مشتق ہے' جو آرامی لفظ "ثنا" سے مطابق ہے اور اسی لئے یہ ثناتک کتاب کے لئے موزوں ہے' جس کے معنی زبانی قانون کے دہرانے یا سکھانے کے ہیں۔

ان دونوں اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ اس کے اصلی معنی دہرانے یا سکھانے کے ہیں' لفظ زبانی یا زبانی قانون کا اضافہ' اگر کسی نے کر دیا ہے' تو وہ لغت کی حیثیت سے نہیں' بلکہ صرف وجہ تسمیہ کی مناسبت دکھانے کے لئے خارج سے اضافہ کر دیا گیا ہے' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نام اس کا کیوں پڑا اس کی تائید کے لئے میں لغات عبرانی کا حوالہ پیش کرتا ہوں۔

شناوشنہ	بدل جانا' جدا ہونا' دوبارہ کرنا' دہرانا
شیم	دو'
شنیم	دوبارہ
مشنہ	دوسرا درجہ' دوسرے درجہ کا' دوچند
مشنا	دوسرا

لغات عبرانی مصنفہ پادری ولیم ہو پرانسپل' دونٹی کالج' شائع کردہ پنجاب رلیجیس سوسائٹی الہ آباد 1880ء صفحہ 420) شنہ کے معنی بھی عبرانی میں دوبارہ کرنا' دوسرا اور پھر کے ہیں' یہی لفظ عربی میں اثنین اثنین' اثنتین مثنہ' تثنیہ' ثنی ثنی' اور ثنی ہے' پہلے تمام الفاظ کے معنی دو اور دوسرے کے ہیں' اور اخیر لفظ کے معنی پھیرنے کے ہیں۔

مشنا اور اس کے مصدر شنا کے یہی تمام معنی عبرانی' انگریزی ڈکشنری' شائع کردہ سموال باگسٹر (لندن) ص 272'273 میں ہیں' تحقیق کیلئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کیجئے۔

انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹر انٹر نیشنل ڈکشنری ہے اس میں "مشنا" (Midhna) کی نسبت حسب ذیل تحقیق ہے۔

"مشنا (عبرانی مشناہ) یعنی تعلیم' زبانی قانون' عبرانی لفظ شنہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دہرانے (ری پیٹ) کے ہیں' قدیم بائبلیکل عبرانی میں اس کے معنی' سیکھنے سکھانے کے ہیں' یہ یہودیوں کے روایتی تعلیمات کو کہتے ہیں جو ربیوں کے زیر نظر خاص طور سے تیسری صدی عیسوی میں مرتب ہوئیں' تالمود کے ایک حصہ کا نام ہے' جس پر اس کی بنیاد ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ "زبانی روایات" اس کے لغوی معنی نہیں' اس کے لغوی معنی دہرانے اور اعادہ کرنے اور دوبارہ کرنے اور دوسرے درجہ کے ہیں' اسکا اطلاق یہود اپنی زبانی روایات کی کتاب پر اسلئے کرتے ہیں کہ وہ گزشتہ قانون کا اعادہ ہے' یا

پہلے قانون پر نظر ثانی ہے' یا توراۃ کے مکتوبی قانون کے بعد یہ زبانی روایت کی کتاب دوسرے درجہ پر ہے' یا قدیم عبرانی کے مطابق اس کے معنی سیکھنے' یا سکھانے کے لے کر' اس کی کوئی مناسب وجہ تسمیہ بنائی جائے۔

مثناۃ

اب میرا کہنا وہی ہے' جو پہلے کہا جا چکا ہے' کہ جس کو عبرانی میں مشنا یا مشناۃ کہتے ہیں' وہی عربی تلفظ میں مثناۃ ہے جس کے معنی دو یا دوہرانے کے ہیں' اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ عبرانی مشنا جس کا ثانی قانونی کتاب پر اطلاق ہوا ہے' اس کے لئے بھی عربی لفظ "مثناۃ" ہے اور اس کی جمع "مثانی" ہے اور خود قرآن پاک نے اس کا کئی مقام پر اپنے اوپر اطلاق کیا ہے۔

ولقد اٰتینا كَ سبْعًا مِنَ المثانی (الحجر) 15:87	اور ہم نے اے پیغمبر! تم کو "مثانی" میں سے سات دیئے'
نزل احسن الحدیث كتابا متشابهاً مثانی (الزمر) 39:23	اس خدا نے اتارا بہترین کلام' ایک کتاب جو باہم موافق اور "مثانی" ہے

مثناۃ کے معنی کتاب کے بھی عربی میں موجود ہیں' نیز مشنا تالمود کے لئے وہی لفظ عربی میں مستعمل ہے' لسان العرب لفظ ثنی کے تحت میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی ابن عاص کی ایک روایت کی شرح میں ہے۔

قیل وما المثناۃ قال' استكتب مِنْ غیر كتاب اللّٰه كانه جعَل ما استُكتبَ مِنْ كتاب اللّٰه مبدأ وهذا مثنیٰ' قال ابوعبیده سألت رجُلاً مِنْ اهل	پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے کہا جو خدا کی کتاب کے سوا لکھا گیا' گویا خدا کی جو کتاب لکھی گئی' وہ پہلی تھی' اور یہ دوسری ہے' ابو عبیدہ نے کہا کہ میں نے توراۃ کے ایک عالم سے جو مثناۃ سے واقف تھا' اور اس کو پڑھ

العلم بالكتاب الاوّل قَدْعرفها وقرأها عن المثناة فقال ان الاحبار والرُّهْبان من بنى اسرائيل من بعد موسٰى وضعوا كتابًا فيهَا بينهُم علىٰ ما ارادوا من غير كتا بْ اللّٰه فهُوالمثناة'

چکا تھا پوچھا کہ مثناۃ کیا ہے؟ اوس نے جواب دیا کہ یہودی عالموں اور درویشوں نے حضرت موسیٰ کے بعد اپنے حسب خواہش خدا کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب بنالی تھی' وہی مشناۃ ہے'

خاتمہ

کیا عبرانی مشناۃ بعینہ یہی عربی مثناۃ نہیں ہے' اب بھی شک کی گنجائش ہے؟ بہر حال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چاہتے' بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے' یا تالمود کی کتاب' دونوں کا ماخذ عبرانی لفظ شنا اور شنہ ہے' جس کے معنی بدلنے دہرانے یا دوسرا ہونے یا دوبارہ ہونے کے ہیں' یا سیکھنے کے ہیں' اور سوائے اخیر معنی کے الفاظ ثنہ' ثنی' تثنیہ اور ثنی اس کے مرادف ہیں' اور عربی لفظ سنت کو جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اصطلاحی معنی طریق محمدی کے ہیں' اس سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں' سنت کا مادہ س' ن' ن یعنی سنن ہے' اور مشنا یا مشناۃ کا عبرانی میں 'ش' ن' ہ' یا الف اور عربی میں ث' ن' ی ہے' اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ ہمارے دوست اپنی تحقیق پر مزید نظر ثانی فرما کر علم اور اسلام دونوں کو اپنا ممنون احسان بنائیں گے' ورنہ ان کی تحقیق کو بقول ان کے ایک یہودی بچہ بھی سن کر ہنس دے گا"۔

آخر میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ "مشنا" زبانی روایات کو بھی نہیں کہتے'

بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس میں یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے' اگر گلستان اخلاقی قصص و حکایات کے کسی مجموعہ کا نام ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ گلستان کے معنی اخلاقی قصص و حکایات کے ہیں۔

دوران تحقیق میں فرماتے ہیں کہ

"مولانا کی یہ دلیل اور بھی پر لطف ہے کہ سنت کا لفظ قرآن میں ہے' اس لئے یہ عبرانی زبان سے ماخوذ نہیں"

میں نے اگر ایسا کہا ہو تو یہ یقیناً غلط ہے۔ لیکن

ع سخن شناس نہ' دلبرا خطا ایں جاست

میں نے خدمت والا میں یہ عرض کیا تھا کہ

"سنت خالص عربی زبان کا لفظ ہے' اس کے لفظی معنی راستہ کے ہیں' لیکن بول چال میں اس کے معنی طریقہ عمل کے ہیں' جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے"۔

ہر صاحب بصیرت میرے استدلال کو سمجھ سکتا ہے' کہ عبرانی لفظ مشناہ (ش) عربی میں مثناۃ (ث) ہے اور جس کے معنی دونوں زبانوں میں دوسرے یا دہرانے یا اعادہ کے ہیں' اور اس سے الگ "سنت کا لفظ ہے' جس کے معنی راستہ اور طریق کار کے ہیں' اور عربی میں یہ دونوں لفظ الگ الگ مستقل صورتوں میں وارد ہیں اور خود قرآن پاک میں ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی — ہم نے تم کو "مثانی" میں سے سات دین'

مثانی جمع ہے' واحد کی صورت وہی مثناۃ ہے' اور سنت الگ ہے'

سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ' — پہلوں کا راستہ یا طریقہ یا سنت

اگر شاۃ اور سنت ایک لفظ ہوتے تو عربی میں شاۃ اور سنت دو لفظ موجود نہ ہوتے' اور قرآن ان کو دو لفظ دو تلفظوں کے ساتھ دو معنوں میں استعمال کرتا' اس سے معلوم ہوا کہ شاۃ اور سنت دو الگ الگ مستقل اور مختلف المعنی لفظ ہیں یہ ہے میرا استدلال جس کی آپ نے غلط تعبیر کی' میرے گزشتہ مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے مضمون نگار کی غلط فہمی واضح ہو سکتی ہے'

معارف جولائی 1930ء

عرب و امریکہ

عرب و امریکہ

عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے 1398ء میں دریافت کیا ہے' یہ شہرت اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ عام متمدن پرانی دنیا کو اس نئی دنیا سے پوری واقفیت اسی وقت سے ہوئی اور اسی کے بعد سے دونوں میں میل جول اور ہر قسم کے علمی و تمدنی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ یہاں تک کہ آج نئی اور پرانی دنیا ایک گھر کے آنگن بن گئے ہیں' مگر یہ صحیح نہیں کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کی کسی نووارد قوم یا اشخاص کے قدم نہیں پہنچے۔

یہ مسئلہ کہ امریکہ تک کبھی عرب جہاز راں پہنچ چکے تھے' گو ہندوستان میں نیا ہو' مگر مصر کے بعض ممتاز فاضلوں نے اس پر متعدد اوقات میں بحثیں کی ہیں' علامہ زکی پاشا نے سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی المتوفی 560ھ کی نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق کا ایک حوالہ پیش کیا تھا' جس میں بحر ظلمات میں اندلس کے چند عرب نوجوان جہاز رانوں کے جہاز چلانے کا ذکر ہے' مگر ابھی تک نہ تو مصر میں اور نہ ہندوستان میں اس مسئلہ کے تمام اطراف پر بحث کی گئی اور نہ تمام ممکن مواد یکجا فراہم کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں تنقیح کے قابل ہیں'

1- کیا عربوں نے' اور زیادہ عام لفظوں میں کیا مسلمانوں نے ''ربع مسکوں'' کے پرانے نظریہ کی تنقید کی تھی'

2- کیا ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصوں کا علم تھا؟

3- کیا ماورائے بحر ظلمات انہوں نے پہنچنے کی کوشش کی؟

4-کیا آج کل کے نئے محققین اس نظریہ کو قبول کر سکتے ہیں؟

ذیل کی سطروں میں ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر اپنی تلاش و فکر کے نتیجے پیش کرتا ہوں' ربع مسکوں' بطلیموس نے دو خطوں کے تقاطع سے روئے زمین کے چار برابر حصے کئے تھے' ایک خطہ قطب جنوبی سے قطب شمالی تک فرض کیا تھا' اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا (اس کو خط استواء کہتے ہیں) وسط افریقہ سے گذرتا ہے' اس طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار فرضی حصے ہوئے دو شمالی اور دو جنوبی اور خط استواء ان دونوں شمالی اور ان دونوں جنوبی حصوں کے بیچ سے گزرتا ہے' بطلیموس کی رائے یہ ہے کہ انسانی آبادی روئے زمین کے ان چار حصوں میں سے صرف ایک شمالی حصے میں ہے' اسی کو اصطلاح میں ربع مسکوں کہتے ہیں یعنی چوتھائی حصہ (ربع) جو آباد ہے' (مسکون) باقی تین چوتھائی حصے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں' اور کچھ گرمی اور سردی کی غیر معتدل شدت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں۔

مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہ تسلیم کیا' لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک و اعتراضات وارد کرنے لگے' بطلیموس کے حامیوں نے اس کی رائے کی صحت پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل گھڑ کر کھڑے کئے' مگر دوسروں نے ان کو توڑ دیا' اور ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا' بیرونی' ابن رشد' طوسی' قطب شیرازی' شریف جرجانی' برجندی' قوشجی' اور چغمینی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب میں یہ بحثیں مذکور ہیں' یہاں مثال کیلئے نصیر طوسی المتوفی 673ھ کے تذکرہ اور اس کی شرح توضیح التذکرہ مؤلفہ نظام عرج (تالیف 711ھ) اور اس کے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

وهذاالتقسيم غير صحيح فاسد، ايضًا لاناما رأينا لهم فی هذه المقدمة شبهة فضلًا من حجة فعلیٰ هذا يحتمل ان يكون فی الارباع الباقية عمارات كثيرة لم يصل الينا خبر هم لما بيننا وبينهم من البحار الفرقة والجبال الشاهقة (نسخۂ قلمی دار المصنفین)

یہ تقسیم صحیح نہیں، غلط ہے، اس لئے کہ ان کے دعوی کے ثبوت میں کوئی شبہ بھی میں نے نہیں پایا، چہ جائے کہ کوئی دلیل ان کے پاس ہو، اس بنا پر یہ بالکل ممکن ہے کہ زمین کی باقی چوتھائیوں میں بہت سی آبادیاں ہوں جن کی خبر ہم تک اس لئے نہیں پہنچی، کہ ہمارے اور ان کے درمیان جدا کر دینے والے سمندر اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔

اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدتِ گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو پرانا نظریہ تھا، اس پر بھی ضرب کاری لگائی، اور کہا۔

لجواز اَنْ يكون مَسكونًا، ولا يصل الَينا خبر هُم للبحار العظيمة والجبال الشامخة الشاهقة المانعتان من ان يصَل خبر هُمْ، (کتاب مذکور)

اس مکان کے سبب سے کہ وہ بھی آباد ہوں، اور ہم تک ان کی خبر اس لئے نہ پہنچی ہو، کہ بڑے بڑے دریا، اور پہاڑ بیچ میں حائل ہوں، جو ان کے حالات ہم تک پہنچنے سے مانع ہوں۔

آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف "ربع مسکوں" ہی کیوں کھلا ہوا ہے، اعتراض اور جواب کے بعد بظاہر کوئی سنجیدہ دلیل نہ پاکر کہا،

وبالجملة ليس لا نكشاف هذا القدرالمذ كورمن الارض اى الربع المسكونُ الشمالى سبب معلوم غير النایة الالٰهية والا لما فضل احد الربعين الشماليين بها اى بالعمارة والسكنى دون الآخر مع تساوى ارتفاعهما بالقياس الى السماديات

حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی حصہ کے صرف کھلے ہونے کا سوائے عنایت الٰہی کے کوئی سبب معلوم نہیں، اور نہ کوئی دلیل اس پر ہے، کیوں ایک ہی شمالی چوتھائی حصہ آبادی اور رہنے کے لائق ہو، اور دوسرا نہ ہو، حالانکہ اس کے سب حصوں کی وضع (پوزیشن) فلکیات کی نسبت سے برابر ہے،

(کتاب مذکور)

شارح نے اس "عنایتِ الٰہی" کے نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کیا، اور کہا کہ ممکن ہے کہ عنایت نے دوسرے ربع شمالی میں بھی آبادی رکھی ہو۔

الجوازان یکون الربع الاخرَ مَسْكونًا معموراً ولم يَصِلُ الينا خبرهُمْ،

اس کا پورا امکان ہے کہ دوسرا چوتھائی حصہ بھی معمور اور آباد ہو، اور وہاں کے رہنے والوں کا حال ہم کو معلوم نہ ہو،

(کتاب مذکور)

اس بحث سے اندازہ ہو گا کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقہ سے سمجھا تھا، اور یونانی نظریہ ربع مسکوں کی کوئی طبعی اور فلسفیانہ توجیہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، نویں صدی ہجری کے وسط

میں قاضی زادہ رومی نے محمود چغمینی المتوفی 745ھ (1344) کی ملخص کی شرح میں جس کو اس نے رصد خانہ سمرقند کے بانی سلطان الغ بیگ کے نام سے لکھا ہے کہا ہے

وسائرالأرباع خراب ظاهراً والا نوصل خبر هُم الّينا غالبا ويحتمل ان يكون بيننا وبَيْنَهُم بحارمفرقة وجبال شاهقة وبواد بعيدة تمنع وصول الخبر الينا غيران احد اربعين الجنوبيين قد حكى فيه قليلاً من العمارة'

اور باقی تین چوتھائی' زمین بظاہر غیر آباد ہے کہ اگر آباد ہوتی تو غالباً اس کا حال ہم تک پہنچتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور وہاں کے باشندوں کے درمیان بڑے سمندر' پہاڑ' اور دور دراز صحرا' ایسے ہوں جو ان کی خبر کو ہم تک پہنچنے میں حائل ہوں' لیکن یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک جنوبی چوتھائی حصہ میں تھوڑی آبادی ہے۔

(ص114 مطبوعہ 2171 لکھنو)

اگر ایک ہی شمالی چوتھائی آباد ہے' تو پھر یہ مسئلہ مشتبہ رہا کہ دو شمالی رخوں میں سے کون آباد ہے' فوقانی یا تحتانی' تو چونکہ ربع مسکون ہی کے مسئلہ کو مسلمان مشتبہ سمجھ گئے تھے اس لئے وہ اس کی علت بتانے میں بھی پس و پیش کرتے تھے' اس لئے انہوں نے صحیح طور سے یہ کہا کہ نیچے اور اوپر کی بحث اس لئے فضول ہے کہ ہر ایک دوسرے کی نسبت سے نیچے اور اوپر ہے' تصریح کے شارح امام الدین لاہوری نے حاشیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

ان فى تعيين هذا الربع تعسّراً بل تعذرلان لوقيل هذا هو الربع الفوقاني لصدق على الآخر'

(ص55)

اس چوتھائی زمین کی تعیین مشکل ہے بلکہ محال ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ فوقانی ربع ہے' تو یہ فوقانی ہونا تو دوسرے کو بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسی کی شرح میں عصمت اللہ سہارنپوری نے کہا ہے

لان کل منهما الفوقانی بالنسبة الٰی من علیه	کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر کی نسبت سے فوقانی ہے۔

اس کے بعد تصریح کی عبارت حسب تحریر ملا عصمت اللہ حسب ذیل ہے

والحاصل انه لیس هُنا علامة یمتازاحدهما عن الآخر ولذلك تراهم یبهمون الکلام ویقولون للمعمور احد الربعین'	حاصل یہ کہ یہاں کوئی علامت ایسی نہیں ہے جس سے ایک حصہ دوسرے سے ممتاز ہو سکے' اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ہیئت اس مقام پر مشتبہ طریقے سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ شمالی ربعوں میں سے ایک آباد ہے۔

(باب ملا عصمت اللہ)

ملا عصمت اللہ اور امام الذین بعد کے لوگ ہیں' لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگلوں کی نقل ہے۔

ابن خلدون مغربی التوفی 808ھ نے مقدمہ میں ربع مسکوں کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے'

"اور یہیں سے حکما نے یہ اخذ کیا ہے کہ خط استواء اور جو اس کے پیچھے ہے آبادی سے خالی ہے' اور ان حکماء پر یہ اعتراض کیا گیا ہے' کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت ہے' کہ آباد ہے تو پھر اس دعویٰ پر دلیل کیسے قائم ہو گی۔

(یعنی دعویٰ ہی غلط ہے)

پھر قدیم حکماء کی طرف سے یہ بات منائی ہے۔

"بظاہر حکماء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خط استواء کے پیچھے آبادی بالکل محال ہے' جبکہ ان کے استدلال نے ان کو یہاں تک پہنچایا ہے' کہ وہاں گرمی کی شدت کے سبب سے پیدائش کا فساد قوی ہے' اور اس لئے آبادی اس میں محال ہے' یا بہت کم ممکن ہے اور وہ ایسا ہی ہے' کیونکہ خط استواء اور جو اس کے پیچھے ہے' گو اس میں آبادی بھی جیسا کہ بیان کیا گیا ہے' مگر بہت کم ہے۔"

اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی 595ھ نے پیش کیا اور کہا کہ خطِ استواء کے دونوں طرف جب یکساں صورت ہے تو خط استواء کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو'

ابن رشد نے کہا ہے کہ خط استوا معتدل ہے' اور اس کے جنوب میں جو زمین ہے وہ ویسی ہے جیسی اس کے شمال میں ہے' تو جس طرح استوا کے شمال میں آبادی ہے' جنوب میں بھی ہو گی" (مقدمہ ابن خلدون)

ابن خلدون اسی خیال کی مزید تشریح اور جواب دیتے ہوئے' کہتا ہے' لیکن یہ کہنا کہ خط استوا میں آبادی محال ہے' تو متواتر بیان اس کی تردید کرتا ہے

(مقدمہ ص 43 مصر)

جو بات ابن رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی 945ء 334ھ نے جزیرۃ العرب میں کہی ہے'

واما خلف خط الاستوا الی الجنوب فانّ طباعة تکون علیٰ طباع شق الشمال سواء فی جمیع احواله الا

لیکن خط استواء کے پیچھے جنوب تک اس کی طبعی کیفیت شمال کی طبعی کیفیت کے مانند ہر چیز میں ہو گی' لیکن صرف اسی قدر اختلاف ہو گا' جن کو میں نے سرائر الحکمة

قدرماذكرنافي كتاب سرائر الحكمة ما ذكرنا اختلاف حالي الشمس في راس ارجها ونقطة حضيضها (ص 5 لیڈن)	میں لکھا ہے، یعنی آفتاب کے نقطہ اوج اور نقطہ حضیض میں اختلاف ہے جو اثر پیدا ہوتا ہے،

اس کے بعد لکھا ہے کہ بحر اعظم کی موج و طغیانی کی شدت کے سبب سے ادہر جنوبی سمت (یعنی جنوبی افریقہ) میں سمندر کی طرف سے جانے کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی۔

ہمدانی نے آفتاب کے نقطہ اوج و حضیض کا جو فرق پیدا کیا تھا، نصیر الدین طوسی التوفی 672ھ نے اس کو کمزور ثابت کیا، اور کہا،

فمن البعيد ان يبلغ تاثيرها الىٰ	یہ دور از قیاس ہے کہ آفتاب کی تاثیر اس
حد يصير احد موضعين	حد تک پہنچ جائے کہ وہ مقام جو وضع
مُتساويين في الوضع	(پوزیشن) میں یکساں ہوں ان میں سے
مَسكونًا والاخر غير مسكون	ایک آباد ہو اور دوسرا غیر آباد ہو!

(تقویم البلدان ابو الفداء)
(ص 5 پیرس)

ادہر علماء تو اس مناظرہ میں مصروف رہے کہ وہاں آبادی ہے یا نہیں یا عقلاً ہو سکتی ہے، یا نہیں، اور ادھر کم لکھے پڑھے سیاح اور جہاز راں خط استواء کو پار کر کے افریقہ کی ہر سمت میں تیر گئے۔

جنوبی حصہ میں افریقہ کا جہاں تک تعلق ہے، عرب تاجر اور سیاح اس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہو چکے تھے، جہاں جہاں موجودہ زمانہ میں اہل یورپ پہنچے، مسافران

عرب کے نشان قدم برابر پائے' عملی عرب سیاح اور جہاز راں خط استواء کو پار کر کے افریقہ کے ایک ایک کونے اور گوشے میں پہنچے اور خط استواء سے نیچے راس الرجال الصاح (گڈ ہوپ) تک سب چھان مارا چنانچہ ابو عبد اللہ البکری کی صفۃ الافریقہ و المغرب' ابن بطوطہ کے سفر نامہ کے آخری ابواب اور ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں ان کے حالات موجود ہیں' لیکن اصلی باشندوں نے توحش اور جہالت اور حیوانیت کے سبب سے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔

ابن خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات 'یلا' تکرور' غانہ اور سلطنت مالی کا نام لے کر کہتا ہے'

"اور آج کے زمانہ میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے' اور ان کے ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں'.............. اور ان کے پیچھے جنوب میں کوئی قابل ذکر آبادی نہیں' ہاں کچھ آدم صورت انسان ہیں' جو انسانوں کے مقابلہ میں جانوروں سے زیادہ قریب ہیں' وہ صحراؤں اور غاروں میں رہتے ہیں' اور گھاس اور غلہ بن پکائے کھاتے ہیں' اور ان میں ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں' وہ انسانوں کے شمار میں نہیں۔ (مقدمہ ص 54 مصر)

مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہو گیا' زنجبار پر وہ قابض تھے اور سواحل میں مدگاسکر (قنبلو) کے مقابل تک ان کا بحری گزرگاہ تھا' مغربی افریقہ گائنا (غانہ) میں ان کی نو آبادی تھی' شمالی افریقہ تو ان کی عظیم الشان سلطنتوں کا مرکز ہے' اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں' اور جنوبی افریقہ کے حیوان نما انسانوں کا حال ابھی پڑھ چکے' لیکن انہوں نے محنت کر کے ان میں سے اکثر جانوروں کو انسان بنایا۔ اور کچھ کو ان کے جانشین اہل فرنگ نے بعد کو انسان بنایا اور باقی آج بھی جانور ہیں' الغرض

"افریقہ کی ہر سمت میں عرب تاجر اور نو آباد پھیل گئے تھے' کانگو' ازدلو' کفر

دریا' (الکفرہ) میں وہ آباد تھے' اور ان کے قدیم آثار موجود ہیں' 1903ھ میں روڈیشیا شمالی ٹرنسوال میں ایک عرب کی قبر ملی ہے جس میں مرنے والے کا نام سلام اور تاریخ وفات 95ھ 714ء کھدی ہے' اسی طرح اہل جرمنی نے چند سال ہوئے مشرقی افریقہ کے اندرونی علاقہ میں قدیم شہر نوکاموین وانگا کے قریب قدیم عربی کتابے پائے جن کووہ برلن عجائب خانہ لے گئے'

"پرتگالیوں کی تاریخ میں ہے کہ جب انکے جہازات جنوبی مشرقی سواحلی افریقہ گڈھوپ' اور نٹائل کے درمیان سفر کر رہے تھے' توانھوں نے عربوں کو پایا' جن کے جہازات سے ساحل بھرا ہوا تھا' اور کفر دریا کے ملک سے بہت سا سونا اپنے جہازوں میں لاد چکے تھے' تاکہ وہ اپنے ملکوں کو لے جائیں(۱)

مغربی افریقہ میں نائجیریا کا وسیع خطہ عربوں کی نو آبادیوں کا مرکز تھا اور ہے 'یہاں پر خصوصیت کے ساتھ ہم کو مغربی افریقہ کے ایک گوشہ سے جس کو عرب خانہ اور اہل یورپ گائنا (guinea) کہتے ہیں' بحث ہے' اور جو قدیم زمانہ سے سونے کی سرزمین ہے' (غانہ) اہل عرب اس سونے کی سرزمین تک بہت پہلے پہنچ چکے تھے' عربی جغرافیوں میں اس کا نام بار بار آیا ہے' اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم میں اس ملک کا نام ہی سونا ہو گیا ہے' عربی میں خالص سونے کو بتر کہتے ہیں یہی بتر اس کا عربوں میں نام ہے' چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں غانہ کا حال غانہ سے زیادہ بتر میں لکھا ہے' یہ گائنا یورپ میں جاکر گنی کی صورت میں سونے کی اشرفی بن گئی'

گائنا خط استواء کے جنوب میں مغربی افریقہ کے اس ساحل پر واقع ہے' جہاں سے جنوبی امریکہ اور پرانی دنیا کا ایک طرح سے محاذ پڑتا ہے' اس لیے اس موقع پر اس کی خاص اہمیت ہے'

---

(۱) یہ دونوں اقتباس المتصطف مصر اگست 1915ء کے مضمون الرحلاۃ الافریقۃ القدیمہ سے ماخوذ ہیں۔

اہل عرب گا ئنا کب پہنچے اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں 'لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ دوسری صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہاں کے سونے کا خراج مصر میں ادا کرتے تھے 'اور وہاں مسلمان عمال اور مزدور آباد ہو چکے تھے '(۱) پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبید عبداللہ البکری المتوفی 487ھ 1097ء نے کتاب المسالک والممالک کے حصہ کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقہ والمغرب میں گا ئنا کا' وہاں کے قبائل کا' ان کے بادشاہ کا' اور اسکی سلطنت کا پورا حال لکھا ہے' اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمدورفت کی اطلاع دی ہے' یہ حالات مصنف نے 460ھ میں لکھے ہیں 'شہر غانہ کے دو حصے تھے' ایک میں مسلمان رہتے تھے' جس میں بارہ مسجدیں تھیں' ایک جامع مسجد تھی۔ ان مسجدوں میں امام و موذن اور علماء سکونت پذیر تھے' دوسرے میں بادشاہ اور اس کے ارباب حکومت رہتے تھے' بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی تھی' جس میں وہ لوگ فریضہ نماز ادا کرتے تھے' جو بادشاہ کے پاس آتے تھے' ملک کے دوسرے حصے میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں' بادشاہ اور اس کے قبیلے کے لوگ اس وقت تک بت پرست تھے' لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے 'لیکن اسی زمانہ میں بادشاہ نے ایک مسلمان کی تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا' وہاں ایک ایسی عرب قوم بھی آباد تھی' جو بنوامیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی' اور یہیں رہ پڑی' بعد کو وہ اپنا مذہب بھی بھول گئی (۲)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ عرب یہاں بنوامیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے شروع میں پہنچ چکے تھے'

چھٹی صدی ہجری میں غرناطہ کے ابو حامد اندلسی المتوفی 595ھ نے جو اسپین سے لے کر چین تک سیاحت کر چکا تھا' اور بغداد میں اقامت گزیں ہو گیا تھا' تحفۃ الالباب کے نام سے جغرافیہ اور عجائب عالم پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ غانہ کے متعلق لکھتا ہے۔

---

(۱) طبری واقعات 235 (۲) کتاب المغرب فی صفۃ افریقہ وبلاد المغرب صفحات ۱۷۴' ۱۷۵' ۱۷۸' ۱۷۹

مطبوعہ الجزائر ۱۹۱۱ء

وبلاد هُم مِمّا یلی المغرب الا علیٰ المتصل بطنجة ممتدا علیٰ بحرالظلمات (۱)

ان کا ملک مراکش کے اس حصہ سے جو طنجہ سے ملا ہے' اور بحر ظلمات (اطلانتک) کے سواحل پر پھیلا ہے' متصل ہے'

ابو حامد کا یہ بیان بہت مبہم ہے' مراکش شمال میں ہے' اور غانہ اس کے جنوب میں اور دونوں کے بیچ میں صحرائے افریقہ ہے' لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے واقف تھا' بہر حال اس کے زمانہ میں ان اطراف کے پانچ قبیلے مسلمان ہو چکے تھے' جن میں ایک غانہ کا قبلہ تھا۔

ان کے بادشاہوں میں سے پانچ قبیلے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے' مسلمان ہو گئے ان میں سے قریب تر غانہ ہے' جس کی ریگ میں خالص سونا پیدا ہوتا ہے' اور ان کے یہاں سونا بہت ہے"

(ص 41 و ص 42 پیرس)

اس کے بعد ادریسی مراکشی المتوفی 560ھ نے سسلی میں بیٹھ کر شاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی' اس میں غانہ کے حال میں جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے' لکھا ہے کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت ہے۔

گنی میں جیسا کہ کہا گیا ہے' بنی صالح نام علویوں کی سلطنت اور حکومت ہے زجار کی کتاب کے مصنف (ادریسی) نے کہا ہے کہ اس کے بانی کا نام صالح بن عبداللہ بن حسن بن حسین ہے۔

---

(۱) تحفۃ الالباب صفحات ۴۲٬۱۴ پیرس'

ابن خلدون کہتا ہے کہ عبداللہ بن حسن کی اولاد میں صالح نام کوئی شخص معروف نہیں ہے، بہر حال ابن خلدون المتوفی 808ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا(۱)

مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں تھا، وہ اسی سلطان کے زمانہ میں غانہ پہنچا تھا اس سلطان اور اس کی مملکت اور قوم کے حالات اس نے اپنے سفر نامہ کے خاتمہ میں بیان کئے ہیں، یہ لوگ دیندار مسلمان تھے اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری و مذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی، یہیں سے ابن بطوطہ سلطان مراکش کی دعوت پر تمام دنیا کا چکر لگا کر اپنے ملک میں واپس گیا ہے(۲)

ابو عبید بکری اندلسی ابو حامد غرناطی، یاقوت رومی جغرافیہ کے ان تینوں مصنفوں کی کتابوں میں زمانہ میں سونے کی بڑی بڑی داستانیں ہیں کہ کس طرح عرب تاجر مراکش اور مغرب سے اونٹوں پر لاد کر نمک اور دوسرے معمولی سامان لے جاتے ہیں اور وہاں سے سونا بھر کر واپس لاتے ہیں، اس داستان کو یہاں زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں، مگر اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ آخری نتیجہ میں یہ بات کام آئے گی۔

شمالی روس اور بحر بیرنگ

جنوب سے اب شمال کا رخ کیجئے، عرب چوتھی صدی کے شروع میں خلیفہ مقتدر باللہ کی خلافت میں انتہائی شمالی روس تک پہنچ چکے تھے، جہاں رات صرف چار گھنٹوں کی ہوتی تھی، وہاں کا بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا، اور خلیفہ سے خواہش کی تھی کہ اس کی اور اس کی قوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگ بھیجے جائیں، خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں ایک وفد وہاں روانہ کیا، وہ آذربیجان ہو کر نہر اتل یعنی والگا طے کر کے

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص 46 مصر ذکر اقلیم اول (۲) سفر نامہ ابن بطوطہ آخری باب،

انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار میں پہنچا' اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا' اس پورے سفر کی روداد اس وقت بھی مختصر طور سے معجم البلدان کے الفاظ بلغار اور روس میں درج ہے' آٹھویں صدی میں ابن بطوطہ شمالی روس کے اس سرے پر پہنچا تھا' جس کے آگے شمالی قطب کی برف پوش زمین تھی' اور جہاں بقول ابن بطوطہ برف پر چلنے کے لئے کتوں کی گاڑیوں کی ضرورت تھی' اور یہ کتے بہت بیش قیمت تھے اس وجہ سے ابن بطوطہ آگے نہ بڑھا(۱) یہ وہی سواری ہے' جس سے آج کل کے بہادر بھی قطب شمالی کی سرزمین کو طے کرتے ہیں۔'

روس کے انتہائی شمال پر دریائے بیرنگ ہے' اس کا ذکر بیرونی نصیر الدین طوسی اور قطب الدین شیرازی نے کیا ہے' اور اس کا صحیح موقع بتایا ہے بیرنگ ایشیاء کی طرف آکر بحر الکاہل میں مل جاتا ہے' اور شمال کی طرف اسی آبنائے بیرنگ کی پتلی سی لکیر شمالی امریکہ (کناڈا) اور پرانی دنیا کے بیچ میں حائل ہے' مسلمانوں کا علمی قدم اس سمت سے اس پتلی لکیر تک آکر رک گیا تھا' جہاں سے شمالی امریکہ منجمد برفستان کے پردہ میں چند قدم پر رہ گیا تھا(۲)

انتہائی آبادی

مسلمانوں میں علم ہیئت اور ریاضی و جغرافیہ کا علم زیادہ تر یونان سے آیا تھا' خصوصا بطلیموس کی کتاب الجغرافیہ اور مجسطی پر انہوں نے اپنی معلومات کی بنیاد کھڑی کی بطلیموس نے خط استواء کو جو افریقہ سے گذرتا تھا' خشکی میں انتہائی آبادی قرار دیا' کیونکہ اس کے خیال میں گرمی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی اس کے بعد ممکن نہیں تھی' اور اسی طرح طول میں انتہائی آبادی افریقہ کے پار بحر محیط کے چند جزائر کو قرار دیا تھا' جن کو اہل عرب "جزائر خالدات" کہتے ہیں' جس کا صحیح ترجمہ "جزائر سعید" یا مبارکہ

(۱) سفرنامہ ابن بطوطہ (۲) تقویم البلدان ابو الفداء ص ۳۰۵' و تذکرہ نصیر طوسی' تفصیل کیلئے دیکھو میری کتاب عربوں کی جہازرانی ص ۱۱۳' ۱۱۶

ہے، جس کو بعض عرب اہل جغرافیہ اور اہل ہیئت نے اختیار کیا ہے' اور جو اصل میں لاطینی لفظ Fortunate کا معرب ہے' اسی یونانی لفظ کو البکری نے اپنے جغرافیہ میں قرطناتس کے نام سے لکھا ہے' اس سے مقصود جزائر کنیری (Canarie) ہیں'

عام طور سے مشرقی اہل ہیئت و جغرافیہ ان کو مفقود اور پانی میں غرق سمجھتے ہیں' مگر مغربی جغرافیہ نویس اس سے پوری طرح واقف تھے' ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری اندلیسی المتوفی 1097ء 487ھ لکھتا ہے'

"اور بحر محیط میں طنجہ کے مقابل اور کوہ اڈلٹ کے سامنے وہ جزیرے ہیں جن کا نام قرطناتس یعنی ہمیشہ سر سبز رہنے والے (سعیدہ) جزائر سعادات (خالدات) ہیں ان کا یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کی پہاڑیاں قسم قسم کے میوؤں اور خوشبودار پھولوں سے معمور ہیں' یہ میوے اور پھول لگائے بغیر خود بخود اگتے ہیں' ان کی زمینیں گھاس کے بجائے معطر پھولوں سے آباد ہیں اور وہ بلاد بربر کے مغرب میں دریائے مذکور میں متفرق طور پر واقع ہیں(۱)

دوسری طرف انتہائی آبادی جزیرہ طولی کو بتاتے ہیں' جس کو برطانیہ کے اطراف میں اب عام طور پر آئس لینڈ کہا جاتا ہے۔

زمین گول ہے اور جذب و کشش سے قائم ہے

اس مسئلہ سے بھی اہل عرب واقف تھے کہ زمین گول ہے اور جذب و کشش کے اصول پر قائم ہے' کسی بیل کے سینگ یا ستون یا پہاڑ کی پشت پر یہ گیند رکھا ہوا نہیں ہے' ابن خردازبہ المتوفیٰ 300ھ کہتا ہے۔

زمین کی شکل گول ہے جیسے گیند جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہے' جیسے

---

(۱) المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ للبکری ص ۱۰۹ الجیریا'

انڈے کے اندر زردی' اور ہلکی ہوا' (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے' اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے' آسمان تک اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں کہ وہی نسیم ان کے بدنوں پر جو ہلکا پن ہے' اس کو کشش کرتی ہے' اور زمین اس کے ثقل کو کھینچتی ہے کیونکہ زمین مثل اس پتھر کے ہے' جس کو لوہا کھینچتا ہے" (یعنی مقناطیس (۱))

اس عبارت میں زمین کی گولائی اور جذب و کشش کے علاوہ جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی پھلکی ہوا سے ادا کیا گیا ہے' آج آپ اس کو بے تکلف "ایتھر" کہتے ہیں' نویں صدی کے آخر کا عرب جہاز راں ابن ماجد مقناطیس کے بیان میں کہتا ہے۔

وقیل اِنَّ السبع السَّمٰوٰتِ وَ الارض معلقات بمقناطیس القدرۃ

اور کہا گیا ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین قدرت کے مقناطیس سے معلق ہے

جذب و کشش کے مسئلہ کو اہل جغرافیہ کے علاوہ دوسرے حکمائے اسلام نے بھی بیان کیا ہے' مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں'

زمین کو گول تو تمام حکمائے اسلام نے تسلیم کیا' مگر مجھے اس دعوی پر وہ استدلال پیش کرنا ہے' جو اہل جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے'

ابن رستہ 277ھ تیسری صدی ہجری میں تھا' وہ زمین کے گول ہونے پر ستاروں کے طلوع و غروب اور ظہور و خفا سے اس طرح محققانہ بحث کرتا ہے'۔

" تمام اہل علم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ زمین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ خشکی و تری کی گیند کی طرح ہے' اور دلیل یہ ہے کہ سورج چاند اور کل ستاروں کا طلوع و غروب زمین کے تمام کناروں میں ایک وقت نہیں ہوتا' بلکہ مشرقی مقامات میں ان کا

(۱) کتاب المسالک والممالک ص ۴ لیڈن

طلوع ' مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے' اور ان کا غروب مشرقی مقامات پر مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے' اور یہ حوادث فلکی سے ظاہر ہے جو آسمان میں ہوتے ہیں' تو ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف مقامات میں ہوتا ہے' جیسے چندر گرہن کہ اگر ایسے دو مختلف شہروں میں ان کو رصد کیا جائے' جو ایک مشرق میں ہو' اور دوسرا مغرب میں' تو مثلاً اگر مشرقی چندر گرہن کا وقت رات کے تیسرے گھنٹہ میں ہو تو................(ابن رستہ ص 12)

زمین کی گولائی پر آج کل جہاز دن کے اولاً مستول پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے' اس سے بھی وہ واقف تھے' مسعودی لکھتا ہے۔

"اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا تو دیاوند کے پہاڑ غائب ہو جائیں گے' اور نظر نہیں آئیں گے اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا تو ذرہ سا پہاڑ کا سرا نظر آئے گا' اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے' پہاڑ ابھرا ہوتا جائیگا اور یہ اس بات پر دلیل ہے' کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے' اور یہی بحر روم میں حال ہے' یہ شام کے پہاڑ جو انطاکیہ اور لاذقیہ اور طرابلس اور جزیرہ سائپرس کے ساحل پر ہیں' کہ جہاز میں نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں اور ساحل کے قریب آتے ہوئے آہستہ آہستہ نظر آتے ہیں۔"

(مروج الذہب جلد 1 ص 195 پیرس)

ابوبکر ابن الفقیہ ہمدانی 290ھ اپنے جغرافیہ کتاب البلدان میں لکھتا ہے'

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے' اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ' تو ساحل کے پہاڑ اور درخت آہستہ آہستہ تمہاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے' پھر جب تم بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ' تو وہ آہستہ آہستہ پھر

دکھائی دینے لگیں گے۔"

(ص153۔ لیڈن)

یہ دلیل بعینہ وہی ہے جو آج بھی زمین کی گولائی پر عام طور سے پیش کی جاتی ہے'

زمین کے فوقانی اور تحتانی حصے اور رات اور دن

ہر چند کہ یہ مسئلہ عربی علم ہیئت میں آفتاب کے دور اور حرکت کے سلسلہ میں عام طور سے مذکور ہے لیکن زمین کے تحتانی اور فوقانی حصوں کی تخصیص کے ساتھ ذکر کرنے میں بے توجہی کی گئی ہے' لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان اس مسئلہ ہی سے واقف نہ تھے' تیسری صدی ہجری کا مصنف ابن رستہ اپنی کتاب الاعلاق النفسیہ کے مقدمہ میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں اور جاڑا گرمی میں روز و شب کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔

لا ن نصف الارض ابداً نهار مضیئٌ ونصفها لیل مظلم یدوران علیها'

کیونکہ نصف زمین میں ہمیشہ دن رہتا ہے' اور دوسرے نصف میں اندھیری رات اور یہ شب و روز اس زمین پر گردش میں ہیں۔

(ص9 لیڈن)

چوتھی صدی کے آغاز کا مصنف مسعودی مروج الذہب میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے'۔

" زمین کی آبادی کا آغاز جزائر خالدات سے شمار کرتے ہیں' جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں' یہ چھ آباد جزیرے ہیں' اور آبادی کی انتہاء چین کی انتہائی آبادی پر ہے' ان دونوں کے درمیان 12 گھنٹوں کی مسافت ہے' اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب جب چین کے انتہائی حصہ میں ڈوبے گا تو ان جزیروں میں جن کا ذکر ابھی ہوا' اور جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں؟ دن ہو گا' اور جب ان جزیروں میں رات ہو

گی' تواقصائے چین میں دن ہو گا' اور یہ زمین کا نصف دائرہ ہے اور وہی آبادی کا طول ہے' جس سے وہ واقف ہوئے ہیں۔

(ج ا ص 180 پیرس)

کرہ ارض کے دوسری جانب آبادی

ربع مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرہ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہو گیا' یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملا ہے ابن خرواذبہ المتوفی 300ھ اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے۔

الاّ انَّ اَلعَمارَةَ فی کرة الأُرض بعد خطّ الاستواء اربع وَ، عِشرون درجة ثمّ الْباقی قد عمر البحر الکبیر فنحنُ عَلی الرّبع الشمالی مِنَ الارض والرّ بع الجنوبی خراب لشدة الحرفیة والنّصف البَاقِی الَّذِی تحتنا لاساکن فِیْه	کرہ زمین میں آبادی خطِ استواء کے بعد 24 درجہ تک ہے' باقی کو بحر محیط نے ڈوبا دیا ہے' تو ہم زمین کے شمالی ربع پر آباد ہیں' اور جنوبی ربع گرمی کی شدت کے سبب سے ویران ہے' اور زمین کے دوسرے نصف میں جو ہمارے نیچے ہے کوئی آباد نہیں۔

(ص 5۔ لیڈن)

اس اقتباس کا آخری فقرہ قابل التفات ہے' کہ وہ زمین کی دوسری جانب کو م از کم خشک اور آبادی کے قابل سمجھتا ہے' گو اس کی آبادی کا اس کو کوئی علم نہیں'

اس کے بعد اسی کے ایک اہم عصر ابن رستہ 277ھ کے قلم سے عجیب و غریب حقیقت تراوش ہو گئی ہے' وہ غلطی کے ساتھ اس قدر تسلیم کرتا ہے۔

وانّ النّاس نَزَلُوا فی النّصفِ الشمالی بین القبة وَبنات النّعش وذالك مقسوم علٰی سَبعُة اقَالیم وَ باقی ذالك غیر مَسکون وینزل فی النصف الجنوبی مَن شاء اللّٰه من الخلق (الاعلاق النفسیه ابن رستہ ص 9 لیڈن)	اور آدمی نصف شمالی میں آباد ہیں قبہ اور بنات النعش کے بیچ میں' اور وہ سات اقلیموں پر منقسم ہے اور باقی حصہ غیر آباد ہے' او ر نصف جنوبی میں جس کو خدا چاہے اپنی مخلوقات سے آباد کرے۔

ابن رستہ ربع شمالی کے بجائے نصف شمالی کی آبادی کا قائل ہے' اور جنوب کی نسبت مشتبہ ہو کر کہتا ہے "وہاں اپنی خلق میں سے جس کو چاہے بسائے"" یہ پیشگوئی انکشاف امریکہ سے پوری ہوئی'

بیرونی' نصیر طوسی' قطب الدین شیرازی اوران کے تلانده کے سوال وجواب اور رّد واعتراض سے لوگوں میں یہاں تک ہمت ہوئی کہ طوالع الانظار کے مشہور مصنف اور ابن فضل اللہ العمری (مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مصنف) کے استاد ابو الثناء محمود بن ابی القاسم اصفہانی المتوفی 1347ء749ھ نے اس نظریہ کے پیش کرنے کی جرات کی۔

لا امنع ان یکون ماانکشف	میں اس کو ممکن سمجھتا ہوں کہ ہماری طرف

عَنهُ اَلمَاءُ مِنَ الارض مِن جِهتنا منكَشِفاً من الجهة الأُخروى ولا امنع ان يكون به مِنَ الحيوان والنبات والمعادن مثل ماعندنا اَو من انواع اواجناس اُخرى

(مسالک الابصار جلد اص 31 مصر)

زمین کا جو حصہ کھلا ہے' وہ دوسری طرف سے بھی کھلا ہو' اور اس کو بھی ممکن کہتا ہوں کہ اس میں بھی وہی حیوان' نبات اور معدنیات ہوں جیسے ہمارے حصہ میں ہیں' یا اور دوسرے قسم کے ہوں

اس سے زیادہ تصریح اور کیا ہو گی' اسی لئے شاید ابن فضل اللہ نے ربع کے بجائے نصف ارض کو مکشوف قرار دیا

والبحر مُحيط بنصف الارض احاطة مُتصّلة دائرة به كالمنطقة لايظهر مِنها الانصفها وَهُوَ مادارت عليه الشمس فی قوس النّهار مثل بيضة مغرقة فی ماء انكشف منها ما انكشفُ انغمرَ ما انغمرَ'

(مسالک الابصار ص 30 جلد 1)

اور پانی نصف زمین کو چاروں طرف سے کمربند کی طرح گھیرے ہوئے ہے' زمین کا آدھا ہی حصہ کھلا ہے' اور یہ وہی ہے' جس پر آفتاب دائرۃ النہار میں پھرتا ہے اس کی مثال اس انڈے کی ہے جو پانی میں ڈوبا ہو' تو اس سے کھل جاتا ہے جو کھل جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے جو ڈوب جاتا ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے' جو بیرونی نے اس سے تین سو برس

پیشتر کہی تھی کہ اس قسم کے امور استدلال نہیں بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہیں۔

جعلوا العمارة فی احد الربعین الشمالیین لا ان ذالك موجب امرطبعی فمزاج الھواء واحدلایتباین ولکن امثاله مِن المعارف موکولٌ الی الخبر مِن جانب الثقة فکان الرّبع دون النصف ھو ظاھر الامر والا ولیٰ بانّ یّوخذ بِهٖ اِلیٰ ان یرد خبرہٗ خبرطاری۔

(تقویم البلدان ابو الفداء ص ۱۱)

اس فن کے عالموں نے دو شمالی ربعوں میں سے ایک ربع کو آباد مانا ہے اس لئے نہیں کہ اس کا کوئی طبعی سبب ہے کیونکہ زمین کے ہر طرف ہوا کا مزاج یکساں ہے لیکن بات یہ ہے کہ اس قسم کے معلومات کسی ثقہ کی خبر اور اطلاع پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے آباد حصہ چوتھائی ماننا بظاہر درست ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس نظریہ کو اس وقت تک مانا جائے جب تک کسی نئی اطلاع سے اس کی تردید نہ ہو جائے۔

ان علماء کو اپنے استدلال و جواب و سوال میں مصروف رہنے دیجئے اور آیئے دوسری طرف ان جاہل جہاز رانوں کی کوششوں پر ایک نگاہ ڈالیں جو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بحر ظلمات کی شناوری میں مصروف ہیں۔

ماورائے بحر ظلمات

عرب کے بے آب ریگستان سے اسلامی فتوحات کا جو سیلاب چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اٹھا تھا وہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں افریقہ و مغرب اقصیٰ اور اندلس کے صحراؤں اور میدانوں سے گذر کر بحر ظلمات کے ساحل پر آکر رکا مگر

بلند ہمت عرب کشور کشاؤں کی ہمت اب بھی اس فطری روک کے پاس آکر کم نہ ہوئی' مغربی اقصیٰ کے فاتح عقبہ نے بحر ظلمات کے پانی میں گھوڑا کھڑا کر کے کہا کہ۔

"خداوندا! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے بعد بھی تیرا کوئی ملک ہے تو میں ذوالقرنین کی طرح وہاں بھی تیری توحید کی دعوت لے کر جاتا!!

(المونس فی اخبار تونس ص 28)

اندلس کا فاتح طارق فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے' اس کا آقا موسیٰ اس کو روکتا ہے وہ جواب دیتا ہے کہ جب تک بحر محیط کی دیوار ہمارے قدم نہ روک لے گی ہم آگے بڑھتے جائیں گے (۱)

ماورائے بحر ظلمات سفر کا تخیل عربوں اور مغربی وافریقی مسلمانوں میں ذوالقرنین کے قصہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا یہ کہانی اتنی پھیلی کہ علم ہیئت کی کتابوں تک میں درج ہے' کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے ملک مغرب میں پہنچ کر اپنا جہاز بحر ظلمات کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا' وہ اس پار کے ایک جہاز کو گرفتار کر کے لے آیا' جس پر ماورائے بحر ظلمات کے کچھ باشندے سوار تھے' ذوالقرنین نے ان سے ان کے ملک کا حال دریافت کیا' رصد گاہ مراغہ کا عالم ہیئت شارح چغمنی اس قصہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے'

"یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان میں بڑے بڑے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ اور صحاری حائل ہوں' جو ان کی خبر ہم تک نہیں آنے دیتے' ہاں دو جنوبی ربعوں میں سے ایک میں کچھ آبادی بیان کی جاتی ہے' اور وہ جو ذوالقرنین کے زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے' وہ بظاہر بے اصل معلوم ہوتا ہے'

(مقالہ ثانیہ فی بیان الارض)

---

(۱) نفح الطیب ج ۱ ص ۱۱۳ مصر'

لیکن اس قسم کی کہانیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی' چنانچہ اسپین وافریقہ کے سواحل میں مغرورین اور مغترین (فریب خوردہ) کے نام سے ایک جماعت ہی قائم ہو گئی' جو اپنے کو مصیبتوں میں ڈال کر اس بحر محیط کے سفر کے لئے روانہ ہوتی تھی' پھر وہ اس میں فنا ہو جاتی تھی' یا کامیاب واپس آتی تھی۔

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع (نویں صدی عیسوی کے آخر اور دسویں صدی عیسوی کے شروع) میں مسعودی اپنی مروج الذہب میں اس قسم کے واقعات کے لئے اپنی دوسری تصانیف کا حوالہ دیتا ہے۔

وَ قَدْ ا' تینا علی ذکر ھا فی
کتابنا فی اخبار الزّمان وفی
اخبار من غرر وخاطر بنفسہٖ
ومَنْ نجا مِنْھُمْ ومنْ تَلَف
ومن شاھدوا منہ وما رأوا

اور ہم نے اپنی کتاب اخبار الزماں میں اور ان لوگوں کے حالات میں ان واقعات کو بیان کیا ہے' جنہوں نے اپنے آپ کو فریب دیا اور اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈالا' اور ان سے جو بچا اور جو ہلاک ہوا' اور انہوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا۔

اس کے بعد کہتا ہے'

واذا منھم رجل منْ اھل
الاندلس یقال لہ' خشخاش
وکان من فتیان قرطبۃ واحداثھم
فجمع جماعۃ من احداثھا
ورکب بھم مراکب

اور ان میں اندلس کے رہنے والوں میں سے ایک شخص تھا' جس کو خشخاش کہہ کر پکارا جاتا تھا' وہ قرطبہ کے نوجوانوں میں سے تھا' اس نے قرطبہ کے اور نوجوانوں کی ایک جماعت بنائی' اور ان کو لے کر ان کشتیوں پر سوار ہوا' جن کو اس نے بحر محیط

استعدهافی هذاالبحرالمحیط فغاب فیه مدة ثم انثنی بغنائم واسعة وخبره مشهور عنداهل الاندلس

(ج ا۔ص158۔پیرس)

میں اس غرض کے لئے تیار رکھا تھا' وہ ایک زمانہ تک غائب رہا' پھر بہت سامال غنیمت لے کر لوٹا' اس کا واقعہ اندلس والوں میں بہت مشہور ہے۔

ادریسی التوفی 560ھ نزہتہ المشتاق میں اندلس کے جغرافیہ میں تین موقعوں پر ان مغرورین یعنی فریب خوردہ جہاز رانوں کا ذکر کیا (۱)ہے یہ بھی لکھا ہے کہ امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشقین کے امیر البحراحمد بن عمر معروف بہ رقم الآذر (نقش بط) نے بحر ظلمات کے ایک جزیرہ پر فوج کشی کی تھی' مگر کامیابی سے پہلے ہی وہ مر گیا۔

ادریسی ایک موقع پر بحر ظلمات کے ذکر میں لکھتا ہے'

"اس بحر ظلمات کے پیچھے جو کچھ ہے' اس کو کوئی نہیں جانتا' اور نہ کسی آدمی کو صحیح واقفیت ہے' کیونکہ اس کو عبور کرنا سخت مشکل ہے' اس کی فضا میں بڑی تاریکی اور اوس کی موجیں نہایت سخت اور اس کے خطرات بہت' اور اس کے جانور خطرناک اور اس کی ہوائیں ہیجان انگیز ہیں' اس میں بہت سے جزیرے ہیں' کچھ آباد' کچھ سمندر کے اندر اور کوئی جہاز راں اوس کو عرض میں قطع نہیں کرتا اور نہ اس میں گھستا ہے البتہ اس کے ساحل کے طول کے کنارے کنارے اس سے لگ کر چلتا ہے (۲)

اب بحر ظلمات میں یہ کون سے جزیرے ہیں؟ کیا امریکن جزائر ویسٹ انڈیز نیوفاؤنڈ لینڈ' گرین لینڈ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔

(۱) نزہتہ المشتاق ص 55-165-184 (۲) ایضاً صفحہ 165

بشونہ (بسمن ساحل پرتگال) کے ذکر میں ادریسی ان' فریب خوردہ جہازرانوں کاایک دلچسپ قصہ سناتا ہے' کہتا ہے'!

اوراسی شہر بسمن میں فریب خوردہ لوگ اس لئے بحر ظلمات میں سوار ہوئے تھے' تاکہ پتہ لگائیں کہ اس میں کیا ہے' اور کہاں جاکر ختم ہوتا ہے' شہر بسمن میں ایک پھاٹک یا گلی (درب) ہے جس کا نام فریب کھانے والوں کا درب ہے' اوران کا قصہ یہ ہے کہ آٹھ آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے' باربرداری کاایک جہاز بنایااور اس میں پانی اور توشہ اتار کھ لیا' جو مہینوں کے لئے کافی تھا' پھراس جہاز میں سوار ہوکر ایک مناسب موسم میں روانہ ہوئے گیارہ دن کے بعد ایک ایسے پانی میں پہنچے جو سخت موجوں والا تھا' وہاں کی ہوائیں مکدر تھیں' روشنی ماند تھی' انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے' تو اپنے بادبانوں کو دوسرے ہاتھ کی طرف پلٹ دیا' اور سمندر میں جنوب کی طرف چلتے رہے' اور بکریوں والے ایک جزیرہ میں پہنچ گئے' وہاں بے شمار بکریاں تھیں جن کو کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا نہ تھا' وہ جزیرے میں اترے' وہاں چشمہ ملا' اور جنگلی انجیر' انہوں نے ان بکریوں میں سے کچھ کو ذبح کیا تو ان کا گوشت بہت ہی کڑوا نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے اوران کی کھالیں لے لیں' اور جنوب کی سمت میں 12 دن وہ اور چلے' اوران کو ایک جزیرہ ملا' جہاں آبادی اور کھیتی تھی' تو وہ اس جزیرہ کو دیکھنے چلے' ابھی کچھ ہی دور چلے تھے' کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں نے ان کو گھیر لیا' اوران کو پکڑ کر جہاز ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے' وہاں ایک گھر میں جاکر اتارا' وہاں سرخ رنگ (اشقر) کم لیکن سیدھے بال والے لمبے قد کے آدمی دیکھے ان کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی تو وہ لوگ تین دن ایک گھر میں قید رہے' چوتھے دن ان کے پاس ایک آدمی آیا' جو عربی میں باتیں کرتا تھا' اس نے ان کا حال دریافت کیا' اور پوچھا کیوں آئے اور کہاں سے آئے' اور تمہارا وطن کہاں ہے' انہوں نے اپنا پورا حال بتایا' اس نے ان

سے بھلائی کا وعدہ کیا' اور بتایا کہ وہ بادشاہ کا ترجمان ہے' دوسرے دن ان کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا' اس نے ان کا حال پوچھا تو وہی بتایا جو کل ترجمان کو بتا چکے تھے' کہ وہ اس سمندر میں اس لئے گھسے تھے کہ دیکھیں اس میں کیا کیا عجائبات ہیں' اور اس کے حالات کیا ہیں' اور اس کی حد دریافت کریں یہ سن کر بادشاہ ہنسا اور ترجمان کے ذریعہ سے ان کو بتایا کہ اس کے باپ نے اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ سمندر کے عرض میں ایک مہینہ تک چلتے رہیں' مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا' اور وہ ناکام واپس آئے' پھر بادشاہ نے ترجمان سے کہا ان سے بھلائی کا وعدہ کرے' اور بادشاہ کے ساتھ حُسن ظن پیدا کرے' اس نے ایسا ہی کیا' پھر وہ اس قید خانہ میں لے آئے' یہاں تک کہ وہ موسم آیا' جب پچھوا ہوا چلتی ہے' تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک مدت تک سمندر میں چلاتے رہے' ان کا گمان ہے کہ تین دن تین رات وہ چلے ہونگے' یہاں تک کہ وہ ایک خشکی میں پہنچائے گئے' وہاں ان کی مشکیں کسی گئیں' اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے' یہاں تک کہ دن نکلا اور روشنی ہوئی اور ہم بندھے ہونے کے سبب سے سخت تکلیف اور بدحالی میں تھے' پھر ہم نے لوگوں کی آوازیں سنیں - چیخے تو وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں اور ہمارا حال دریافت کیا' ہم نے بتایا' یہ لوگ بربر تھے' ان میں سے ایک نے کہا تم جانتے ہو کہ تمہارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے' انہوں نے کہا معلوم نہیں' انہوں نے کہا دو مہینوں کی مسافت یہ سن کر ان فریب خوردہ جہازرانوں میں سے ایک کی زبان سے وا اسفی (ہائے افسوس) نکل گیا' تو اس مقام کا نام اسفی پڑ گیا اور وہ مغرب اقصیٰ کے بندرگاہ کا نام ہے (۱)

جزئی اغلاط اور دنوں کے اندازہ سے قطع نظر کر کے کیا ہم اس مقام کو جہاں تک یہ فریب خوردہ جہازراں پہنچے تھے' شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں' اور سرخ رنگ

(۱) نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق صفۃ افریقیۃ والاندلس ص 104 الائیڈن'

کے انسان وہی تو نہیں، جن کا نام غلطی سے ریڈ انڈینس (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے، جو وہاں کے اصلی باشندے ہیں'

ابن خلدون التوفی 808ھ آٹھویں صدی میں بحر محیط کے ایک سفر کا حال لکھتا ہے جس میں اہل فرنگ کے چند جہاز بحر محیط کے کسی جزیرہ میں اتفاقاً پہنچ گئے تھے' چونکہ بحر محیط کے اندر یا انتہا پر جزائر خالدات کے علاوہ کوئی اور نام معلوم نہ تھا' اس لئے اس کے اندر کی ہر آبادی کو اور خشکی کو جزائر خالدات کہہ دیتے تھے' چنانچہ وہ مقدمہ میں کہتا ہے'

"بحر محیط میں بہت سے جزیرے ہیں' جن میں تین بڑے اور مشہور ہیں' اور کہا جاتا ہے کہ وہ آباد ہیں اور ہم کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی) کے بیچ میں اہل فرنگ کے چند جہاز ادھر سے گذرے' اور انہوں نے وہاں لوٹ مار کی' اور وہاں کے کچھ باشندوں کو پکڑ لائے اور مراکش کے سواحل پر ان کو بیچا' اور وہاں سے وہ سلطان کے پاس پہنچے' جب ان لوگوں نے عربی سیکھ لی' تو انہوں نے اپنے جزیرہ کا حال بتایا' کہ وہ کاشت کاری کے لئے زمین سینگ سے کھودتے ہیں' ان کے یہاں لوہا نہیں ہے' جو کھاتے ہیں' اور ان کے مویشی بھیڑیں ہیں' اور لڑائی میں پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں' اور آفتاب کو پوجتے ہیں۔

اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے' اور صحیح کہتا ہے۔

ولا یوقف علی مکان ھذہ الجزائر الا بالعثور لا بالقصد الیھا (ص45)	ان جزیروں کا صحیح پتہ نہیں معلوم' اتفاقاً وہ مل جاتے ہیں' اور بالارادہ نہیں ملتے'

اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ جہاز ہوا کا رخ جاننے اور ستاروں کی سمت معلوم

کرنے سواحل کے بحری نقشوں کی مدد سے چلتے ہیں'

وھذا کله مفقود فی البحر المحیط (صف45) اور یہ تمام مسلمان بحر محیط میں مفقود ہیں

اسی لئے جہاز اس کے بیچ میں ہو کر نہیں چلتے' کیونکہ اگر سواحل کا منظر آنکھوں سے دور ہو جائے' تو واپس آنے کی راہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے' ساتھ ہی اس سمندر کی فضاء میں اس کے پانی کی سطح پر اتنے بخارات رہتے ہیں جو جہازوں کو چلنے نہیں دیتے' اور آفتاب کی روشنی پہنچنے نہیں پاتی' اسی لئے اس میں راہ پانا' اور اس کا معلوم ہونا مشکل ہے""

(مقدمہ ص 45)

ان تمام قصوں کو ممکن ہے کہ دلچسپ کہانیوں ہی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا لیکن آج کل امریکہ کے کولمبس کی دریافت کی جو تنقیدی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں انہوں نے ان کہانیوں کو سنجیدہ تاریخ بنا دینے کی سند پیدا کر دی ہے۔

نئی تحقیقات

امریکہ کے انکشاف کی جو تنقیدی تاریخیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نئی اور پرانی دنیا میں کولمبس سے پہلے سے تعلقات قائم تھے' ان تعلقات کی تعمیر میں کون کون سی قوموں نے حصہ لیا' اس کی دریافت تاریخی اور اثری ذریعوں سے اب تک کی گئی تھی' لیکن ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیونیر کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے' اس کا نام "افریقہ اور امریکہ کی دریافت" ہے' اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ 'کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں' موصوف نے امریکہ میں پرانی آنے والی قوموں کی

دریافت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے' انہوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں کی اصلی زبان کی فیلالوجیکل تحقیقات کے ذریعہ سے یہ پتہ لگایا ہے' کہ امریکہ کے باشندوں کی پرانی زبان وقتاً فوقتاً کن کن زبانوں سے مانوس و متاثر ہوتی رہی ہے' وینیر صاحب چھبیس' انسانی زبانوں میں بآسانی گفتگو کر سکتے ہیں' اور امریکہ کی پرانی زبان کے بڑے ماہر ہیں' اس کتاب کا خلاصہ انگریزی رسالہ' "ورلڈ ٹوڈے" فروری 26ء میں چھپا تھا' جس کا اعتراف المقطف اگست 26ء میں اور اردو ترجمہ معارف اگست 1927ء میں طبع ہوا۔

وینیر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی فرانسیسی' ہسپانی اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ ہیں' وہ عربی زبان ہے' یہ الفاظ ان کی تحقیق کے مطابق 1290ء کے قریب اس میں داخل ہیں اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اس کے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے' وینیر نے کاغذی دستاویزوں سے ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے پہلے بحر اوقیانوس میں تجارتی جہاز رانی ہوتی تھی' مگر تاجر و سوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی ان بحری مہموں کو چھپاتے تھے۔

کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں' وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے' کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا' بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے طلائی سکے جس کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملا کر بناتے تھے) دکھائی دیئے "گونینس" اس وقت کی افریقہ کی زبان میں سونے کے ان ٹکڑوں کو کہتے تھے' جن کو شکل میں سونا ساحل گنی (غانہ) سے یورپ میں لایا جاتا تھا' قدرتی طور پر سونے کے یہ ٹکڑے دیکھ کر کولمبس متحیر ہو گیا' کیونکہ وہ دراصل اسی سونے' ہاتھی دانت اور قیمتی سامان کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا' اس نے امریکہ کے باشندوں سے

دریافت کیا کہ انہوں نے وہ سونا کہاں سے پایا' اس کے جواب میں انہوں نے کہا" ہم نے یہ سونا کالے سوداگروں سے لیا ہے جو جنوب مشرق سے یہاں آئے تھے"" کولمبس کو گمان ہوا کہ وہ سونے کی اصلی کان بتانے سے گریز کرتے ہیں' تیسرے سفر میں اس نے پھر وہی سوال کیا' اور وہی جواب پایا اور آخر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ پرانے امریکیوں کے جواب درست تھے' ابتدائی گوئنینس جو فرانسیسی اور پرتگالی گنی ساحل سے لاتے تھے خالص سونے کے نہیں ہوتے تھے' بلکہ غانہ والے اس میں اسی کے برابر تانبہ ملا دیتے تھے' جب کولمبس کی لائی ہوئی گوئنینس کا کیمیائی امتحان کیا گیا تو اس میں سونے اور تانبے کا وہی تناسب نکلا' جو غانہ (گنی) کے لائے ہوئے گوئنینس میں تھا۔

یہ طلائی ٹکڑے دراصل افریقہ ہی سے آئے تھے' ایسے ہی جو حبشی اس کو وہاں ملے' وہ افریقہ ہی سے آئے ہوں گے' جہازوں کے کپتانوں کے ہر سفر سے پایا جاتا ہے کہ ان کے لئے خلاصی حبشیوں کی موجودگی ضروری تھی' وہ بطور ترجمان استعمال کئے جاتے تھے' کولمبس بھی ان میں سے چند کو پہلے سفر میں ساتھ لے گیا تھا' امریکہ جاکر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے موجود ہیں' یہی وہ لوگ تھے' جن کو جنوب مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا' انہی کے ساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہنچے تھے' اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ' عربی پودے اور عربی تہذیب وہاں پہنچی۔

پہلے آثار قدیمہ کے ماہروں کا یہ تنہا بیان تھا' اور اب زبانوں کے محقق بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں اور دونوں کا متفقہ دعویٰ ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئی دنیا افریقی عربی تمدن سے بہت حد تک متاثر ہو چکی تھی'

امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں "ازت" اور "مایہ" جو افریقہ کی عربی تہذیب کی حامل تھیں' معلوم نہیں ان کی اصلیت کیا ہے' مگر یہ نام صحیح عربی ناموں

کی تحریف معلوم ہوتی ہے' پہلا نام ازو ہے اور دوسرا نام معاویہ ہے ازو کی نسبت پہلے ہم لکھ چکے ہیں(۱) کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمان سے افریقہ اور مڈگاسکر کے بحری جہاز راں تھے اور بہادری سے اپنے جہاز بحر برابرہ میں چلایا کرتے تھے۔

بہر حال رسالہ مذکور وینیر کی تحقیق کا خلاصہ آگے ان الفاظ میں دیتا ہے'

"ازٹ اور مایہ کہ تہذیبیں دراصل امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں' اوران کا زمانہ 1150 سے 1200ء تک قرار دیا جاتا ہے"

ہم نے "مغرورین" کے سفر کا جو زمانہ لکھا ہے' وہ اسی کے قریب ہوتا ہے'

"عربی تہذیب نویں صدی عیسوی میں اپنے معراج پر تھی اور 1100ء میں صحرائے اعظم کو عبور کر کے افریقہ کے مغربی مینڈ ینگو کا تجارتی صوبہ قائم کر چکی تھی' اس کے مقابل میں امریکہ کا صوبہ میچوکن(۲) تھا جو خلیج میکسیکو کے ساحل پر واقع تھا' عربی الفاظ کی آمیزش سب سے پہلے میچوکن میں پائی جاتی ہے' اور وہ الفاظ مینڈ ہنگو کی زبان میں ملتے ہیں' اور یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے' کہ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ جو ایک تجارتی کارندہ یا سیاح استعمال کرتا ہے' مثلاً جادو' ادویہ' مذہب اور نظام حکومت کے متعلق" یہ نتیجہ کہ منڈ ینگو اور میچوکن کے درمیان آمدورفت بھی لابدی ہے' ہر طرح تازہ تحقیقات سے اس کی تائید ہوتی ہے' ازٹ اور مایہ کی تہذیبوں کا یک لخت انحطاط اس کا ایک اور ثبوت ہے' چونکہ یہ ایک طرح کی نو خیز تہذیبیں تھیں' جس وقت ان کا اپنے اصلی مرکز سے قطع تعلق ہو گیا ان میں تنزل آنا شروع ہو گیا' یہ امر کہ یہ تعلق صرف تجارتی تھا' اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی تہذیب کا اثر میچوکن میں داخل ہو کر صرف تجارتی راستوں کے آس پاس ہی پایا جاتا ہے' اور یہ صرف خالص عربی کا اثر تھا"

اگر مسٹر وینیر کی ان لسانی تحقیقات کے نتائج درست ہیں' تو ہم نے ان کی تصدیق کے لئے جو مقدمات گزشتہ صفحوں میں فراہم کئے ہیں' وہ بھی قابل قبول ہیں۔

---

(۱) عربوں کی جہازرانی ص ۱۷۲' (۲) میکسیکو میں ایک ریاست بحر الکاہل ریاسفک سے ملحق ہے۔

پرانے عربوں کی امریکہ میں آبادی

اس نظریہ کو سن کر لوگوں کا بجا سوال تھا کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمدورفت تھی، تو امریکہ میں ان کے نشانات کیوں نہیں ملتے، اور ان کی کسی نو آبادی کا پتہ یہاں کیوں نہیں لگتا، مگر خدا کی قدرت دیکھیئے کہ عین اس وقت جب یہ سطر یں زیر تحریر تھیں، امریکہ کے عربی اخبار "الہدیٰ" نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی، اور خود ہندوستان کے اردو اخبارات نے اس کے اقتباسات دسمبر 1930ء میں شائع کیے، براعظم امریکہ میں وہاں کی مہذب ریاستوں اور متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل اور گاؤں ہیں جہاں اس براعظم کے پرانے باشندے آباد ہیں اور جو اب تک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جہاں تک اب تک کسی یورپین سیاح کے قدم نہیں پہنچے ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ مقامات میکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں، اخبارات راوی ہیں (۱)

"ایک شامی عرب تاجر میکسیکو کے چاپاس اور ہٹاسلا کے صوبوں میں پھیری کر کے سوداگری کا مال بیچتا تھا، حال میں اتفاقاً اس کا گزر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا جہاں آمدورفت جاری نہیں تھی، چلتے چلتے ایک جنگل میں پہنچا، وہاں ایک قبیلہ دیکھا، رات ہو چکی تھی، سوداگر نے اسپینی زبان میں ان جنگلی باشندون سے شب بھر رہنے کی درخواست کی، اس کے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمہاری بولی نہیں سمجھتے، عربی سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سن کر حیرت میں آگیا اس نے ان سے عربی میں گفتگو کی، اور انھوں نے کہا کہ وہ صدیوں سے اس جنگل میں آباد ہیں اور

---

(۱) المعظم دسمبر 1920ء والمساء مورخہ 27 شعبان 49 12ھ مطابق 16 جنوری 1931ء و پیام کلکتہ مورخہ 28 دسمبر 1930ء

عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے"

سوداگر مذکور کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ اب تک اپنے عربی رسم و رواج پر قائم ہے اور خالص عرب ہے، یہ خبر میکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ کی تحقیق حاصل کرنے کے لئے روانہ کیا ہے۔

یہ قبیلہ چار سو برس سے زیادہ سے یہاں آباد ہے، اور دوسرے ہمسایہ قبیلوں سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتا ہے۔

اس خبر سے جغرافیہ نویسوں کے بیانات اندلس اور پرتگال کے عرب "مغرورین" (فریب خوردہ جہاز رانوں) کی کہانیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ کی اخیر خبر یہ ہے کہ لبنان کے عیسائی فاضل انطون یوسف بشارہ نے جنھوں نے میکسیکو میں سکونت اختیار کرلی ہے، مصر کے اخباروں میں پچھلے سال یہ اطلاع شائع کی ہے اور جو الفتح مصر مورخہ 30 جمادی الاولی 1354ھ ص 246 میں چھپی ہے کہ وہ میکسیکو میں اپنی زمین واقع ریو کرسی (میکسیکو) میں کھدائی کرا رہے تھے، کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے، جو تحقیق کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے، اس دریافت کا وہاں کے علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے۔

کولمبس اور امریکہ

یہ تحقیق تو الگ رہی کہ مشہور یوں ہی ہے کہ کولمبس پہلا شخص ہے جس نے اس نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملایا مگر اس نے جو کچھ پایا اتفاقیہ پایا کہ ع

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے،

کولمبس ہندوستان اور چین کی تلاش میں تھا کہ امریکہ پہنچ گیا، کسی علمی استدلال سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا، اور بقول ایک اطالوی عالم ہیئت اور مستشرق کرلونلینو کے کہ "کولمبس عربوں کی مقدار مسافت اور میل کے صحیح اندازہ کے نہ

جاننے کی مبارک غلطی سے امریکہ پہنچ گیا" فاضل اطالوی عالم کی اصل عبارت عربی کا ترجمہ یہ ہے'

"لاطینی کتابوں کے عربی ترجموں کے ذریعہ سے مامون نے ایک درجہ فلکی کی پیمائش کا جو اندازہ نکالا تھا یعنی 56 2\3 میل' وہ یورپ میں بھی مشہور ہوا' اور جس طرح یونانی اور سریانی کتابوں کے عربی ترجمہ کے ذریعے سے یونانی میل کی مقدار نہ جاننے سے اہل عرب نے غلطی کی' اسی طرح چودہویں صدی اور پندرہویں صدی میں عربی میل کی صحیح مقدار نہ سمجھنے کے سبب سے اہل یورپ غلطیوں میں مبتلا ہو گئے' انہی میں کرسٹوفر کولمبس امریکہ کا پتہ لگانے والا بھی تھا' اس نے ایک درجہ کے 56 2\3 عربی میل کو لاطینی 65 2\3 سمجھ کر مغربی یورپ اور ایشیا کے مشرقی سواحل کی مسافت اس سے بہت کم سمجھی جو حقیقت میں ہے' اگر یہ غلطی نہ ہوتی' تو کبھی ممکن نہ تھا کہ مغربی یورپ سے اوقیانوس میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر صرف چند مہینوں کی خوراک لیکر چین پہنچنے کا تخیل کرتا۔ آخر اس سفر سے رک کر وہ اس غلطی کی بدولت امریکہ کے جدید براعظم پہنچ گیا' جس نے ایک نئے انسانی دور ترقی کا آغاز کیا' یہ غلطی کیسی مبارک تھی' جس نے دنیا کو عظیم الشان فوائد سے مالا مال کر دیا(۱)

کولمبس اس وقت ظاہر ہوا' جب اہل اسپین اندلسی عربوں سے آخری لڑائی لڑ رہے تھے' اور ان کو اپنے ملک سے نکال رہے تھے' اس کا زمانہ اسپین اور پرتگال میں گزرا' ایک معمولی سیاح سے جہاز راں تک پہنچا' وہ ہیئت جغرافیہ اور سفرنامہ کی کتابیں پڑھا کرتا تھا' ایک اسپینی خاتون سے شادی کی' اس ذریعہ سے اسپین کے ایک عیسائی خانقاہ کے جغرافیہ داں راہب سے ملا' پھر اس کا پیشہ یہ ہو گیا کہ وہ جہاز رانوں کے لئے

---

(۱) خطبات علم الفلک عند العرب ص293

بحری نقشے تیار کر کے فروخت کرتا تھا' اور بحری مسافروں اور جہاز رانوں سے معلومات جمع کرتا تھا' عین اسی عربی اور اسپینی لڑائی کے زمانہ میں وہ ملکہ اسپین سے نئے جزیرہ اور نئے بحری راستوں کیلئے مدد کا طالب ہوا' اس زمانہ میں اسپین اور پرتگال کے عیسائی موروں (مسلمان عربوں) کو نہ صرف اسپین بلکہ تمام سواحل و جزائر سے نکالنے کیلئے ہر طرف بحری بیڑے بھیج رہے تھے' سواحل بحر محیط سے لیکر سواحل افریقہ سے یہاں تک کہ عرب اور ہندوستان کے سواحل تک سے عرب جہاز رانوں کو لڑ لڑا کر نکال رہے تھے' اور ان سے بحری نقشے حاصل کرتے تھے' وہ سونے کی کان والے افریقی ساحل تک بھی گیا تھا' جہاں افریقی اور زنگی ملاح بکثرت پرتگالیوں کو ملتے تھے۔

بہر حال اس زمانہ میں یورپ اور خصوصاً اسپین اور پرتگال میں علم ہیئت ہندسہ' جغرافیہ اور بحری سفر کے معلومات جو کچھ تھے' وہ عربی تصنیفات' یا ان کے تراجم کے ذریعے تھے' جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں میں مورخین نے بیان کیا ہے' اور اس طرح کولمبس اپنے نظریہ کی ترتیب و تکمیل میں تمامتر عربوں ہی کی تحقیقات سے مستفید ہوا۔

(معارف مارچ و اپریل 1939ء)

سفرِ گجرات

سفر گجرات کی چند یادگاریں

جولائی 1933ء میں بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا' اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں' اول یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا' دوسرے یہ کہ عرب سے جو علماء دریا کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے' وہ پہلے یہیں اترتے تھے' موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے' ہندوستان سے جو علماء عرب جانا چاہتے تھے' وہ اسی راستے سے سفر کرتے تھے اس صوبہ کے سیکڑوں دیہات حرمین محترمین کے مصارف کیلئے وقف تھے' دوسرے ملکوں سے جو نادر اور بطور تحفہ چیزیں یہاں آتی تھیں وہ پہلے یہیں پہنچتی تھیں' حج کیلئے ہر سال ہزاروں علماء امراء اور عام مسلمان اسی راہ سے منزل مقصود کی

طرف روانہ ہوتے تھے۔

اخیر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدان جنگ یہی خطہ تھا اور اس لیے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہاں رہتا تھا اور اس تعلق سے یہ صوبہ کبھی پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بن جاتا تھا' اور ہر قسم کے اہل کمال ادھر کا رخ کرتے تھے'

دکن و گجرات کے علاقے میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے' اور جو ہے وہ ہندوؤں کی کثرت' زور قوت' اور سیلاب تمدن میں غرق ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستان خاص سے وہ بہت دور ہے' اس لئے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں میں مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی' سلطان عالمگیر کی دوربین نگاہوں سے ان وجوہ و اسباب کا نتیجہ چھپانہ تھا' سلطان نے اس پورے علاقہ میں علماء صوفیہ' اور مذہبی معلمین کی قطار در قطار آباد کر دی' موذن خطیب' امام اور ملاّ (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے) موروثی مقرر کر دیئے' اور ان سب کیلئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے جو آج تک ان کے اخلاف کے قبضہ میں ہیں' وہاں کے دیہاتوں میں آج تک ان ہی ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے' یہاں تک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے' تو یہ خون اسی کے ہاتھوں سے کراتا ہے' یہاں اب بھی ایسے سیکڑوں ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں جو انہی مذہبی فرائض کیلئے یہاں آباد کئے گئے تھے اور ان کو اس کیلئے سرکاری اوقاف دیئے گئے تھے' جن پر وہ آج تک قابض ہیں' اور انہی کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے' اور مسلمانوں کی کچھ ممتاز صورتیں وہاں نظر آتی ہیں۔

بھڑوچ

جس کے کنارے دریائے نربدا بہتا ہے' اور جو آگے چل کر بحر عرب میں

مل جاتا ہے' عربوں کے جنگی و تجارتی آمدورفت کا مرکز تھا' عرب اس کو بروص کہتے ہیں 14 ھ میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں جب اسلام کے ملکی فتوحات کا شباب تھا' ان کے جنگی جہاز اس ساحل پر آکر لگے تھے' سفر کے اثنا میں جب میں بھڑوچ پہنچا اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا' تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں اور گو میں شاعر نہیں' تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کر لی'

نربدا! اے نربدا! اس جادہ بحر عرب!
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز

گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادہ بحر عرب
تیرے دروازہ پر ٹھہرا تھا' مرا پہلا جہاز

تو گذشتہ کاروانوں کا نشان راہ ہے
رشتہ ہندو عرب تجھ سے ہوا تھا استوار

ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اس کی یادگار

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
آج کس کو یاد ہے وہ داستان پاستان

چار صدیوں تک رہا' اسلام کا دمساز تو
تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں

تو ہے دریائی پری یا شاہد عالم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک سرشار جام

اس سمندر کے گلے کی شہ رگ اعظم ہے تو
اس تن آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام

اے بھڑوچ! اے خاتم انگشت رود نربدا
تو تیاے چشم ظاہر آج تیری خاک ہے

عہد ماضی کی تیری عزت رہے باقی سدا
ذرہ ذرہ پر تو خورشید ذی لولاک ہے

یادگار عہد خیر القرن ہے تیری زمین
چشم عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں

مطلع انوار ذی النورینؓ ہے تیری جبیں'
تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

یہ ترانا تال سر اور زیر و بم سے خالی ہے اسلئے اہل وجد و سماع اس پر کان نہ دھریں

بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان

بھڑوچ میں عہد عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے جو یہاں مسند قضا

پر متمکن تھا' اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نور الدین شیرازی صاحب ہیں لب دریاان کا فضیلت کدہ یادگار زمانہ ہے ایک موروثی کتب خانہ ان کے اسباب زینت میں ہے' افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے' اس لئے میں کتب خانہ کی سیر نہ کر سکا' مگر میرے ایک عزیز نے ان کا کتب خانہ دیکھا ہے' اس کے حسب ذیل نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا '

اس خاندان کے چند نوادر کتب

(1) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم آخر میں ہے'

"ذو القعدہ 1090 ہجری میں بسنت رائے نے قصبہ مچھر ہٹہ سرکار خیر آباد میں تحریر کیا"

(2) حدائق (۱) البحرفی و قائق الشعر مؤلفہ محمد بن محمد بن عبد الجلیل العمری بہ رشید و طواط آخر میں ہے'

"تم الكتاب بعون الملك الوهّاب وحسن توفيقه عَلٰى يَد الْعبَد الضعيف محمد الحافظ الهروى' تحريرًا فى يوم الا ثنين ثانى عشر مِنْ ربيع الْاوّل ٨٦٢ھ اثنين و سِتّينُ وثما نماية الهجرية النبويّة بد ارالسُّلطنة شيراز بزمان قيد'

(3) المحيط للسرخى جلد ثانى جمع الامام الهمام مولا نارضى الدّين محمد بن محمد بن محمد سرخسى الحنفى' آخر میں ہے

" كان الفراغ مِن كتابته فى يوم الرابع ذوالقعدة ٩٠٩ھ كاتب على بن على بن

(۱) یہ کتاب ایران میں چھپی ہے اور ملتی ہے۔

رمضان العبادی الشافِعی الازھری"

(4) گلستان' متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ'

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری نے اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین بن سید احمد حسن رضوی نے 1219ھ میں نقل کیا'

(5) مخازن المعروف جلد ثانی' شرح مشکوٰۃ فارسی' از کتاب الزکوٰۃ تا کتاب البیوع دوسری تیسری اور چوتھی جلد ہے'

صفحہ اول مطلا ہے' تقطیع کلاں' اسپر خواص خاں غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر 1225ھ ہے' ابو معروف حسین 1112ھ بھی تحریر ہے'

مدرسہ دارالارشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے'

(6) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاوٰی) مولفہ ظاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری ناقص ازوسط تقطیع کلاں مختلف مسخ شدہ مہریں ہیں' آخر میں ہے'

"تمّ کتاب الخلاصة من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر المدعوابحافظ البخاری علی ید افقر عبیده محمد المدعوا صفی الدّین بن محمد الخطیلی ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد فی دولة الملك محمد بن مراد بن سَلیم بن سُلیمان بن سَلیم بن بایزید بن شهور سنة ثلاث بعد الالف ۱۳۰۳ھ نقل مِن نسخة تاریخها یوم الجمعة العشرین مِن شهر ربیع الّاول سنة ثلاث وتسعین ستة مایة'

(7) مجمع البحرین" ترجمہ" اپکھت پرم ہنس" از اتھرین وید' فارسی' شاہ سرمد

نے 1136ء میں سنسکرت سے ترجمہ کیا'کتاب نندرام' ولد اننت رام' خط فارسی نستعلیق 13x تقطیع صفحات 82'

ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدیں

قاضی صاحب کے عزیز خاص جن کو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے' وہ موجود تھے' ان کا دولت کدہ بھی گزشتہ جاہ و جلال کا کہنہ مرقع تھا' موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی سیر کرائی ان کی عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے' جس پر 430 کا یہ کتبہ لگا ہے۔

هذه العمارة القديمة فی شهور 430ھ

اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے' بہر حال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جا سکتا ہے' کہ یہ اس صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملہ گجرات سے چند سال بعد کی ہے' جو بہر حال کوئی مستقل فتح نہ تھی۔

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار وہاں کی سنگی جامع مسجد ہے' اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ 458ھ ہے' بعد کو محمد تغلق کے عہد میں 721ھ میں دروازہ کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے' گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے' اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے۔

"در عہد دولتِ سلطان عالم غیاث الدین والدنیا' محمد تغلق ہفت و صد و بست و یک"

غالباً ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہو گی'

انکلشور کا ایک خاندان

بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلشور نام ہے' جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا' یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم صاحب ہیں' جو اکبر کے معاصر تھے 1005ھ میں انہوں نے وفات پائی ہے' ان کی خانقاہ و مسجد یہیں واقع ہے' خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعام دار ہے' موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے' اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں' گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں۔

اس خاندان کے چند نوادر کتب

عربی کتابوں میں سب سے زیادہ چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے اس کا سال کتابت 588 ہے نسخہ بخط عرب شیرہ خرما سے لکھا ہوا ہے اور اب تک اچھی حالت میں ہے۔

حقہ کی تاریخ

یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں' جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے' یہ تاریخ "خوشی جیؔ" کے الفاظ سے نکالی گئی ہے جس سے 1029ھ نکلتے ہیں' چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے' اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو 1129 جہانگیر کا عہد ہے'

بنائے سورت کی تاریخ

گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحر عرب سے جا کر ملتا ہے' دریائے تاپتی ہے

اس کے کنارے پر شہر سورت آباد ہے' اور دوسرے کنارے پر راندھیر پہلے بحر عرب میں جانے والے جہازوں کا بندرگاہ راندھیر تھا' مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی' اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا' اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ 937ھ نظر آئی' تاریخ کا مصرع یہ تھا'

ع:- باد آباد بندر سورت

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے' اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے' اس یادداشت میں اس فتح کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی تھی۔

بنا کرد مسجد بجائے کنشت　　　برایوانش انا فتحنا نوشت
(591ء)

راندھیر کی پرانی مسجد

چند دوستوں کی دعوت پر راندھیر جانے کا بھی اتفاق ہوا' یہ دولت مند دیندار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے' اور دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں' پورے ہندوستان میں کہیں نہیں آئیں' ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد چونا دوارہ ہے' یادداشت مذکور میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی'

گر کسے پرسد زتو نافع ازیں معبد شریف　　　گو مسمی مسجد اعلیٰ و در باب شریف
795ھ

گجراتی ہندوی کے بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دیں' جن میں سے درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں۔

لغت عربی و ہندی

عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک نعت ملا، جس کے شروع کے چند شعر یہ ہیں

اللہ	خدا	ہے	کرتار	الخالق	آفرید سرجن ہار
الدنیا	گیتی		سنسار	الاحمق	نادان گنوار
الجنت	بہشت		سرگ	السقر	دوزخ مرگ
الیوم	روز		دیس	الشعر	موے کیس
اللیل	شب		رات	القول	گفت بات
السبیل	راہ		پاٹ	السبع	ہفت سات
الاسم	نام		ناؤں	الموضع	دیہہ گاؤں
الظل	سایہ		چھانوں	المقام	جائیگہ ٹھانوں
الراس	سر		سیس	العشرین	بیست بیس
العین	چشم		آنکھ	اللحیہ	ریش پانکھ
الاذن	گوش		کان	الورق	برگ پان
الطعام	خوردن		کھان	السہم	تیر بان

آخری حصہ:۔

الفرح	خوشی	بلاس	القنوط	ناامید	نراس
الفخذ	ران تہی	جانگ	الجسم	تن ہے	انگ
المورد	آب خورا	درارہا	السمر	افسانہ	پواڑا
الکدر	تیرہ	گدلا	النقیم	نابینا	اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا'

اسی قسم کا ایک عربی لغت بر در عزیز سید نجیب اشرف ندوی کی ملکیت میں ہے' مگر وہ اس کے علاوہ ہے' اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں'

الالہ	پرستیدہ	پوجیا	المعلوم	دانستہ	پوچھیا
الحمد	ستودہ	بھانیا	المعروف	شناختہ	پچھانیہ
الرسول	فرستادہ	بھیجیا	الواضح	روشن	تجیا
الال	وودمان	کنبہ	التقود	خوشہ	لونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے' اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کے لغت یہاں لکھے گئے ہیں۔

رسالہ فقیری چہار پیر چودہ خانوادہ

اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے،

بدانکہ بوجھ تون یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا' زہد پوچھے ویسے وگرنہ تو فقیری نہ کرے۔

سوال اگر تیرے پوچھے کہ اول فقیری کیا ہے' و آخر فقیری کیا ہے' اور خانہ یعنی گھر فقیری کیا ہے' اور کیلی فقیری کیا ہے اور لقمہ فقیری کیا ہے۔

اسی قسم کے سوال وجواب پر رسالہ کے اکیس صفحے ختم ہوئے ہیں' تصنیف

و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے۔

رسالہ فقہ ہندی

یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے' آغاز کے اشعار یہ ہیں

حمد و ثنا سب رب کوں خالق کل جہان ۔ لائق حمد ثنا ے کے اور نکو نہ جان
علم شریعت نال وی بھیجا پاک رسول ۔ جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
یارب اپنے کرم سوں بیحد بھیج درود ۔ نبی محمد مصطفیٰ تسوں ہوں خوشنود
پیچھو ان کی آل پر اور اصحاب تمام ۔ تس پیچھو! حباب پر بہت درود سلام
کیتے مسئلے دین کے عہد رکھے امین ۔ فقہ ہندی زبان سے بوجو کر ویقین
مطلب مسئلے پوچھنا جو کچھ ہوے زباں ۔ عربی ترکی فارسی ہندی یا افغاں

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں' اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں' خاتمہ میں تصنیف کا سال 1075ھ بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے' خاتمہ میں ہے۔

فقہ ہندی کوں موماں کرو زبان پر یاد ۔ مسائل او ین دین کے کبھی نہ ہوے فساد
سنہ ہزار پچھتر ۱۰۷۵ھ بیچ ماہ رمضان تمام ۔ اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے' جو عربی فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے' اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانے میں ہندی کس کو کہتے تھے۔

داستان حضرت ماہ رمضان

اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے' مصنف کا نام بدیع الدین ہے' شروع کے شعر حسب ذیل ہیں۔

سرنامہ از نام سبحان لکھوں
که دل کی ورق پر سجل کر لکھوں
زبان کو ہے جو ہر اسی کو ثنا
اسی کو سو قدرت ہے جگ میں عیاں
کریم و رحیم و وہ غفار ہے
کرم عاصیاں پر کرنہا رہے
زہر چیز اس کی صنعت کا بیاں
که پیدا کیا جن نے ارض وسما

آخر میں لکھا ہے۔

کرو اس کی سب نعمتوں پر شکر
مصیبت کے اوپر حکم ہے صبر
که تا عاقبت تیری ہووے بھلی
که شادی و غم جگ میں جاے چلی
بدیع الدین تعریف عمل کی کرو
که چھوٹک کی جس سیں توقع دھرو

اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبیں اور قافیوں میں صرف صوفی ہم رنگی ہے' عربی الفاظ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے' جس طرح ہندی میں بولے جاتے ہیں۔

داستان قیامت

اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے

سخن ہے مراجوں گل بوستان
نصیحت کی باتوں سنو واستان
لباسی مسلماں کہاتے ہیں دوست
که کھاتے ہیں سب گائے بکری کا گوشت
لباس شریعت کریں تن مین
شریعت کی باتاں نہ کچھ من مین
بڑی ریش تسبیح خوش پیرہن
بھری دل میں کئیں بھات کے مکروفن

آخری شعر میں اس نظم کا سال 1077ھ (7) بتایا گیا ہے۔

سنہ ایک ہزار دستوتر نے سو
لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو
بتاریخ غرہ دریں ماہ پیر
باتمام آن شد' مدد دستگر

فقہ مبین

یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

بنام پاک ربُّ العالمین سوں   شروع کرتا ہوں فقہ مبیں سوں
بحق مفخر مقبول مرسل   سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل
مسائل فقہ کے ہیں اصل ایماں   جو نیں بوجے سودہ کیوں ہوئے مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام 40 ماخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے' پہلے ایمان کے مسائل پھر طہارت' وضو' غسل وغیرہ اس کے آخر میں بدعت کا رد اور جوئے کی برائی ہے آخر میں ہے۔

یقیں فقہ المبیں کوں کرتے فحتوم   بحق دین پناہ آل معصوم
صد د ہشاد و دو الف ۱۱۸۲ھ ہجرہ   بتاریخ ہمایوں گشت تمت
اگھیارہ سو میں اسی اوپر دو   سنہ ہجری نبیوں کے بتایو

رسالہ کے آخر میں خاتمہ کی عبارت ہے'

نسخہ قوت دیں فقہ المبین تصنیف حضرت شاہ یقین رحمتہ اللہ علیہ

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین' کتاب کا نام قوت دین المبین" اور تصنیف کا سال 1182 معلوم ہوتا ہے'

مثنوی کتخدائی

کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے' رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

ثناء وہے درگاہ یزداں   وہ خالق سب کا ہے کیا جن وانساں
ثنا و حمد کے لائق سدا ہے   سزا وار اوخدائی کا خدا ہے
محمد اشرف اولادِ آدم   حبیب وسرور و سردار عالم
شہِ آدم محمد سرور دیں   کہ ختم الانبیاعلیہ ہیں رہ بردین
ہوا جس شان میں لولاکؔ وارد   دیکھوں محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہا السلام کی تعریف میں چند شعر ہیں' اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے۔

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف   نزاکت سیں لکھوں میں اس کی توصیف
مہیاب کیا ساماں اظہر   لباس وزیور ولولو وگوہر

اس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں' در وصف الطعام' در وصف الحلل در وصف بردن برات' در وصف شہر گشت' در وصف نکاح خوانی' در بیان خلوت خاتمہ اس پر ہوتا ہے۔

سخن کو مختصر کاں تک لکھے گا   یہ ہے طومار آخر کوں تھکے گا'
بعشرت عیش بادا سازداری   مری یو مثنوی ہے یادگار
شب بست ودوم ازماہ رجب   کہ شادی ہور شہر گشت ہے شب
سنہ ہجری دراں وقت بود موجود   ہزار ویک صدو تسعین ویک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال 1191ھ معلوم ہوتا ہے' وزن سے حرفوں کا گرنا اس وقت معیوب نہ ہوگا'

وفات نامہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

آغاز

ہنا اول کروں حمد خدا میں — زباں اوپر آپس کی ابتداء میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت — ہنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے جس میں زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے۔

مجھے توفیق دے یا رب کہ بولوں — ہنا ہجر نبی دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں کتابت کا سال 1251ھ ہے

قصہ بانو

اس مثنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے' جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا' اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے'

عزیزاں روایت سنوں کان دھر — اول فارسی تھی یہ دکھنی دگر
اتھا گودڑہ ایک شہر کا جو نام — ہمیشہ فتح کا اتھا واں مقام
بٹھے ایک دن اس جمعہ مسجد منے — اتھے خرد بزرگ او سارے جنے
دتے ہیں مسافر نیا آن کر — سلام علیک کہہ کے بیٹھا مگر
پوچھے سب نے ان کو تو کاں سے آیا — شہر ہے دور ہے نام محمد حیا
لگا بولنے کوں اوپوں سن کے بات — زلیخا کا قصہ اونوں کے سنگات
مگر ساری مجلس نے سن کر کلام — لگنے بولنے آفریں سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے' آخر میں ہے۔

فتح مختصر کر تو اپنی زباں کہاں تک تو لکھے گا اس کا بیاں

زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ خاص لحاظ کے قابل ہیں "تھا" اور "تھے" کی جگہ "اتھا" اور "تھے" "اور کی جگہ او، تین کی جگہ منے، کہاں کی جگہ کاں وہ کی جگہ "او"

قصہ سوداگر عجم

یہ نظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان میں ہے آغاز اس طرح ہے۔

ثناء اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں درود اں مصطفیٰ اوپر دل و جاں سیں میں پڑھتا ہوں
درود اں حمد کے پیچھوں حمایت اک کہوں نادر عزیزاں تم سنوں اسکوں رکھوں دل کو تیں حاضر

آخر میں تاریخ ہے۔
۱۱۵۶
گیارہ سواوپر چھپن برس گزری تھی حضرت کے تبھی تصنیف میں آئے خوارق پیر حضرت کے
توجہ رحمت اللہ پر کرو تم اے شہ جیلاں صفائی باطنی ہوئے اسے اے حضرت میران

خالق باری

ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے، اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے، لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں شک ہے، تعجب کی بات ہے کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ نظر آیا، لیکن وہ بھی قدیم نہیں، رسالہ تاریخ سے گو معرا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سو اسو برس سے زیادہ عمر کا نہیں۔

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے' جو بدا یا بڑا پڑھا جاتا ہے'

ع واحد ایک بڑا کرتار

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ تصنیفات خسرو میں جو نسخہ چھپا ہے' اس میں یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے' اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے لیکن عربی میں بدا کرتار کے معنی میں میرے پندار میں نہیں آیا ہے' معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے فاصل ہیں' اس کی سند کیا ہے' موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا لکھا گیا ہے' لیکن یہ بھی مہمل ہے بعض مطبوعہ نسخوں میں "خدا" چھپا ہے' اور شاید یہ صحیح ہو'

زیر بیان نسخہ میں اول تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے' دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر میں قدامت زبان کی جھلک دکھائی دی یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے' جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے۔

چوں بہ پرستی خسر پورہ کیست' جو کا بھائی ہے — در خسر پرسی جا کو باپ جن دی جائی ہے
ریخت اندر گوش خود سیماب دی بورا بھیا — پنبہ پیچک روئی گالا' جسم تن آمد۔ کیا
واں نہالی بستر وبالیں تکیہ اے جوان — غلط بالا۔ لیٹ اوپر اس بچھاؤ۔ گستر آن

حسب ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ نمبر 184 میں اس طرح چھپا ہے۔

عطسہ چھینک' شاخ سینگ' کفش گر ہے کفش دوز
گازرو خیاط ہے' دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا' فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم

ہے' پیش نظر نسخہ میں یہ غلطی نہیں' پھر دوسرے مصرع میں قافیہ دوز مکرر ہے جو درست بھی نہیں اور جامعہ دوز تو خیاط' اور درزی کے تقابل کے بعد بے معنی سا ہے' پیش نظر نسخہ میں یہ شعر یوں ہے۔

عطسہ چھینک وشاخ سینگ وکفش گر ہے کفش دوز
گاذر و خیاط ہے دھوبی و درزی دیس روز

اس کے بعد تتمہ نسخہ مطبوعہ نمبر 185 میں ہے

وانکہ بد بخت ست بھاگ بخت بھاگ   فارسی آمد سرود وہند و می گویند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع میں غلط ہے دوسرا رکن ٹوٹتا ہے اور تیسرا رکن غائب ہے' چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے' پیش نظر نسخہ میں یہ غلطیاں نہیں

وآنکہ بدبخت ست بھاگا' بخت در قسمت است بھاگ
فارسی آمد سرود و ہندو می گویند راگ

مطبوعہ نسخہ میں ہے

ع ' طعم سواد' وطعام خورش جو کہیے کھانا

پیش نظر نسخہ میں طعم کی جگہ "مزہ" ہے' جو زیادہ بامزہ ہے'

مطبوعہ میں ہے'

درّ و مروارید   موتی جانیے   ہم صدف سیپی' سمندر مانیے

پیش نظر قلمی نسخہ میں دوسرا مصرع یوں ہے

ہم بسدرانی گلے پیچھانے

اس قسم کے اختلافات اور بھی ملیں گے' لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے' مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانہ' مابعد کی ضمیریں کر دی ہیں' مثلاً' قدیم "توں" کی جگہ "جدید تو" بہت پرانی زبان میں متکلم "ہوں" تھا' جواب بھی ہوتا ہے واحد متکلم کا صیغہ ہے' حضرت خواجہ فرید شکر گنج 584 میں پیدا ہوئے' اور 670 میں وفات پائی اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے 525ھ میں وفات پائی ہے' غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے' حضرت خواجہ شکر گنج کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے شائع کیا ہے' اس میں واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیریں "ہوں" اور "توں" استعمال ہوئی ہیں' بعینہ یہی دونوں ضمیریں پیش نظر نسخہ میں ہیں' مثلاً

خواہم گفت کہوں گا ہوں   خواہم کرد کروں گا ہوں
خواہی آمد آوے گا توں   خواہی نشست بیٹھے گا توں
خواہم دید دیکھوں گا ہوں   خواہی دید دیکھے گا توں
خواہم داد دہوں گا ہوں   خواہی داد دیوے گا توں
خواہم دوید دوڑے گا ہوں   خواہی دوید دوڑے گا توں

مطبوعہ نسخہ میں "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ تیں ہے'

سفر گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں' مگر دیکھتا ہوں کہ قلمی سفر

بھی خاصہ طویل ہو گیا ہے' ہم سفر ناظرین کے ملال راہ کا اندیشہ ہے' اس لئے قلم کی باگ یہیں روک لی جاتی ہے'

(معارف ستمبر 1936ء)

تقریر مشرقی پاکستان

(بنگلہ دیش)

تقریر مشرقی پاکستان

پاکستان کو ہر چیز نئی بنانی پڑی

یاران بزم تاریخ! مشرقی پاکستان میں بزم تاریخ (ہسٹاریکل سوسائٹی پاکستان) کا سب سے پہلا اجلاس ہے، اس عظیم الشان تاریخی موقع پر آپ نے صدارت کے فرائض کا بوجھ مجھ پر رکھا ہے اس سے میرے حقیر خدمات پر جو اعتماد آپ نے کیا ہے اس کا میں دل سے شکر گزار ہوں۔ یہ حقیقت آپ کو معلوم ہے کہ تقسیم سے پہلے جس قدر علمی تحریکات اور علمی ادارے ہندوستان میں قائم تھے وہ کل کے کل بھارت میں رہ گئے۔ جس طرح پاکستان کو اپنے سیاسی اور انتظامی اور حکومتی انتظامات کو از سر نو قائم کرنا پڑا۔ اسی طرح علمی میدان میں بھی اس کو ہر چیز نئے سرے سے قائم کرنی پڑی ہماری مشہور درسگاہیں، ہماری یونی ورسٹی، ہمارے کتب خانے اور سارے ادارے ہندوستان میں چھوٹ گئے جو اب بھارت کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہیں اور پاکستان آکر یہاں پھر ہر چیز نئی بنانی پڑی اور خدا کا شکر ہے کہ پانچ برس میں بہت کچھ انجام پایا ہے اور پا رہا ہے ہر جگہ درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور گورنمنٹ اور قوم دونوں اپنی اپنی کوششوں میں مصروف ہیں۔

مسلمانوں کی قوت تعمیر و تنظیم

پاکستان کے مسلمانوں کو اپنے تمام اداروں اور علمی و تعلیمی مرکزوں کے چھوٹنے پر مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ ان کو اس ماحول کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے ان کو اپنے نئے ملک میں ہر چیز کو نئے سرے سے بنا کر دنیا کے سامنے ان کو اپنی قوت تنظیم

اور قابلیت حکومت کے مظاہرہ کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ مسلمان پہنائے عالم میں پھیلے اور ہر جگہ ان کو اپنا ہر کام از سر نو کرنا پڑا۔ وہ ویرانوں میں پہنچے اور ان کو معمورۂ عالم بنایا۔ عرب کے ریگستان سے لیکر عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ، اسپین اور دوسری طرف ایران، ترکستان، خراسان ہندوستان ہر جگہ انہوں نے اپنی تنظیمی و تعمیری قوت کا مظاہرہ کیا۔ دیہات بسائے، قصبے بنائے، شہر تعمیر کئے اور اس طرح ہر ملک کو جوان کے علم کے نیچے آیا اس کو آباد کیا اور اپنے تمدن اور معاشرت و ثقافت کے مطابق ایسا بنایا جس کی مدح ستایش تاریخ کی زبان سے آج بھی سنی جا سکتی ہے۔

ہندوستان کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصہ

خود ہندوستان کی مثال آپ کے سامنے ہے، جہاں اسلام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مسلمانوں نے یہاں آکر اپنے تمدن و معاشرت و ثقافت کے ہر مظہر کو نمایاں کیا۔ اگر صرف ایک ہی چیز سامنے رکھی جائے اور کوئی اسکالر اس کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنائے تو عظیم الشان اور ناقابل انکار نتائج کی امید ہے اور وہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں پر جو اس وقت آباد ہیں یا جن کا نشان ہندوستان کی اسلامی تاریخوں میں ملتا ہے ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی آبادکاری کیا تھی اور مسلمانوں نے اپنی آمد کے بعد کتنے دیہات، کتنے قصبے، کتنے شہر آباد کئے اور ان کو کس طرح علمی و تعلیمی و تمدنی عمارات سے معمور کیا۔ اگر آج ہندوستان کے دو نقشے بنائے جائیں۔ ایک ہندوستان قبل اسلام کا اور ایک ہندوستان بعد از اسلام کا تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے پہلے یہ ملک کتنا بنجر اور غیر آباد علاقے رکھتا تھا اور مسلمانوں نے ان کو کتنا آباد اور معمور کیا۔ سارے صوبوں کو چھوڑ کر اگر صرف دھلی سے عظیم آباد پٹنہ تک کا ہی علاقہ آپ دیکھیں اور اس میں دیہاتوں، قصبوں، شہروں اور دارالحکومتوں کو گنیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمان آبادکاری نے کتنا عظیم الشان کام اس

ملک میں انجام دیا ہے۔ ریلوے لائنوں پر جو آبادیاں واقع ہیں ان کے ناموں پر اور تاریخ تعمیر پر نظر غائر ڈالئے تو حقیقت سامنے آجائیگی۔

دنیاتی تعمیر میں مسلمانوں کا حصہ

اسلام کے عہد میں اسپین کے مشہور شہر پہلے کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ شمالی افریقہ میں طرابلس سے لیکر مراکش تک رومیوں نے اپنے بعد کیا چھوڑا تھا اور مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ان کو کیا بنادیا۔ یہی حال ہر اس ملک کا ہے جو مسلمانوں کے تصرف میں آیا۔ دھلی جیسا آباد اور معمور دارالسلطنت چھوڑ کر اگر پاکستان کو کراچی جیسی جگہ ملی اور کلکتہ جیسے معمور اور ترقی یافتہ شہر کو چھوڑ کر اگر پاکستان کو ڈھاکہ جیسا شہر ملا تو گویا قدرت کو یہ دکھانا ہے کہ مسلمان آج بھی اپنی تعمیری و تنظیمی قوتوں کا مظاہرہ کریں اور پاکستان میں نئی دلی اور نیا کلکتہ آباد کر کے دکھائیں اور قوم جو غرناطہ ' قرطبہ ' اشبلیہ ' بلنسیہ ' قیرواں ' فاس ' طرابلس الغرب ' قاہرہ ' بغداد ' اصفہان ' نیشاپور ' تہران ' غزنین ' دھلی ' حیدرآباد ' بیجاپور ' احمد نگر ' لکھنئو ' علی گڑھ اور دیوبند بنا سکتی ہے وہ کراچی ڈھاکہ ' چاٹگام ' ملتان ' راولپنڈی اور پاکستان کے غیر آباد علاقوں کو از سر نو بسا کر اور بنا کر ایک نئی دنیا بنا سکتی ہے اور بنا رہی ہے۔ ہماری قوم کیلئے یہ کوئی نیا کام نہیں ہے بلکہ ہم خوش ہیں کہ انگریزوں کے تمام تعمیر کردہ اور بنائے ہوئے کارخانے ' ادارے ' سوسائٹیاں سب بھارت میں رہیں اور پاکستان کو غیر ترقی یافتہ علاقے ملیں تاکہ وہ اس عہد جدید میں اپنی تعمیری و تنظیمی قوتوں کا دوبارہ مظاہرہ کریں اور تاریخ میں اپنی کوششوں سے نئے ابواب کا اضافہ کریں۔

اسلامی اکثریت کے صوبے اور انگریزی عہد

انگریزی عہد کے ہندوستان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ چیز واضح ہو گی کہ

انگریزوں کی تجارتی تنظیمیں، تمدن اور تعلیمی جدوجہد کے مستحق صرف وہ صوبے ٹھہرے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور جن صوبوں میں ان کی اکثریت تھی وہ انگریزوں کی نظر التفات سے ہمیشہ محروم رہے۔ غور کیجئے کہ روئی سندھ میں پیدا ہوتی تھی مگر کپڑے بننے کے سارے کارخانے بمبئی کے احاطہ میں تھے۔ جوٹ مشرقی بنگال کی پیداوار تھی مگر اس کے کارخانے سب کلکتہ میں تھے لڑنیوالے سپاہی پنجاب میں بھرتی کئے جاتے تھے مگر اسلحہ بنانے کے کارخانے ہندوستان میں تھے۔ یہی حال دوسری چیزوں کا تھا۔ تعلیم کیلئے یوپی میں چھ یونی ورسٹیاں ہیں لیکن سندھ، سرحد، مشرقی پاکستان اس سے محروم رہے۔ ڈھاکہ یونی ورسٹی ضرور انگریز کی یادگار ہے مگر معلوم ہے کہ کلکتہ یونی ورسٹی نے اپنی شاہنشی میں یہ خود مختیاری کبھی پسند نہیں کی۔

ایشیاٹک سوسائٹی کا مرکز کلکتہ اور بمبئی بنے۔ مگر لاہور چھوڑ کر کوئی پاکستانی علاقہ کسی علمی و تعمیری کام کا مرکز قرار نہ پاسکا۔ سندھ کا مرکزی صوبہ مدتوں بمبئی کی گرفت میں رہ کر اپنی ترقیوں سے محروم رہا، اور کتنی کوششوں کے بعد اس کو بمبئی سے آزادی ملی۔

ہندوستان کی علمی سوسائٹیاں بھارت کی ملکیت بن گئیں

میں نے ان واقعات کا اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ پاکستان کو اپنی تاریخ آپ بنانی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ علمی ادارے جیسے انڈین ہسٹری کانفرنس، انڈین سائنس کانگریس اور دوسرے علمی ادارے اور تجربہ گاہیں اور تحقیقی مراکز جو پہلے قبل از تقسیم ہند میں تھے وہ بھی بھارت کی ملکیت قرار پائیں اور پاکستان کو اس سلسلہ میں بھی اپنی ذاتی کوششوں پر بھروسہ کرنا پڑا۔ تین سال

ہوئے کراچی میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی اس کے منانے میں جن بزرگوں نے حصہ لیا وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ آنریبل فضل الرحمان اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کے نام اس سلسلہ میں خاص ذکر کے قابل ہیں' نیز اس سوسائٹی کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر سید معین الحق کی محنت اور جدو جہد بھی شکریہ کی مستحق ہے' سوسائٹی کی طرف سے کل پاکستان ہسٹری کانفرنس کا پہلا اجلاس کراچی میں بڑے بے سرو سامانی سے ہوا دوسرا اجلاس لاہور میں پنجاب یونی ورسٹی کی سرپرستی میں ہوا اور تیسرا آج ڈھاکہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی دعوت پر ہو رہا ہے ان اجلاسوں میں جو مضامین پڑھے گئے باوجود دلوں کے عدم اطمینان اور کتابوں کی کمیابی کے وہ ہر طرح حوصلہ افزا ہیں۔

ہمارے کام

اس وقت ہماری سب سے بڑی کمی کتب خانوں کا نہ ہونا اور کتابوں کی نایابی ہے' پرانی کتابیں بازاروں سے ناپید ہیں' اور جو ملتی ہیں' تجارتی قواعد اور آمدورفت کی مشکلات ان کے حصول میں حائل ہیں' ضرورت ہے کہ بھارت اور پاکستان کی تجارتی وزارتیں علمی و تعلیمی اشیاء کی آمدورفت میں سہولتیں پیدا کریں' اور ان کو روئی اور جوٹ اور غلہ کی قسم کی اشیاء سے ممتاز کریں کراچی میں اگرچہ اسمبلی لائبریری۔ نیشنل لائبریری اور لیاقت لائبریری کا کام شروع ہو چکا ہے۔ مگر وہ منزل ابھی دور ہے جب وہ تحقیقاتی اغراض کیلئے کار آمد ہو سکیں۔

اسی طرح ہمارے آثار قدیمہ (آرکیالوجی) کے ادارے بھی بالکل نئے ہیں گو کہ ٹیکسلا' موئنجوداڑو وغیرہ کے نادر نمونے موجود ہیں۔ تاہم نئی اثری تحقیقات کیلئے ابھی بڑا میدان کھلا ہے۔ عربوں کے سندھ پر حکومت کے اثرات ابھی تک ریگستان کے ڈھیر میں چھپے ہیں۔ منصورہ اور بیضاء کی تعین نہیں ہو سکی' حتیٰ کہ دائبل کی

مشہور بندرگاہ کی تلاش میں ابھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اور عرب اور دیسی حکمرانوں کے سکوں کی بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ ہمارا محکمہ تحقیقات اثری اپنی کوششوں کو ادھر متوجہ کرے گا' ابھی ان سطروں کے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ پشاور کے عجائب خانہ میں عربی کا سب سے پرانا کتبہ موجود ہے جس کی تاریخ سن 226 بتائی گئی ہے' اسی ہفتہ کے اخباروں میں مشرقی پاکستان میں ایک عربی کتبہ کی برآمدگی کی اطلاع ملی جو علاؤالدین خلجی کے عہد کا ہے اور اس وقت وہ تحصیل کی کچہری میں امانت ہے' ڈھاکہ کے نام کے ساتھ مولانا حکیم حبیب الرحمان مرحوم کی یاد آئی جو مشرقی پاکستان کے مشہور مورخ تھے اور جن کو سکوں کا بھی شوق تھا بنو امیہ سے لیکر سلاطین ہند تک کے سکے ان کے پاس تھے جن کو انہوں نے ڈھاکہ کے آثار قدیمہ کو دے دیا تھا' سندھ کے سومری اور سمہ بادشاہوں کے کچھ سکے راجپوتانہ میں ملے اور وہ جیپور کے عجائب خانہ میں ہیں' جن سے بادشاہوں کے بعض ناموں کی تصحیح ہوتی ہے اور ان کی ترتیب میں مدد ملتی ہے۔

مسلمانوں کا فن تاریخ

مادی تعمیری و ثقافتی اشیاء کی طرح علوم و فنون کی اشاعت بھی مسلمانوں میں بنو امیہ کے زمانہ سے شروع ہوئی' طب کی کتابیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد سے یعنی ہجرت سے سو برس کے بعد ترجمہ ہونے لگیں' مگر تاریخ کا فن وہ ہے جس کا آغاز حضرت امیر معاویہ کے زمانہ سے شروع ہو گیا۔ انہوں نے یمن سے اور دوسرے شہروں سے علماء کو بلوا کر واقعات کی ترتیب کا کام شروع کرایا' علم حدیث و سیر کی کتابیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے کتابوں کی صورتوں میں منتقل ہونا شروع ہوئیں' جس طرح فن حدیث یادداشتوں' رسالوں اور مجموعہ' شیوخ سے شروع ہو کر صحاح و مسانید و سنن کی حد تک تیسری صدی میں پہنچیں' اسی طرح تاریخ بھی پہلے مخصوص

واقعات اور مخصوص قبائل کے احوال سے شروع ہو کر ضخیم مجلدات تاریخ کی صورت میں آئیں ابن ندیم کی فہرست سے ظاہر ہو گا کہ ابتدائی تاریخ کی کتابیں صرف چند خاص خاص واقعات کی تدوین تک محدود ہوتی تھیں۔ مثلاً قبیلہ طسم جدیس' مناقب قریش' واقعہ حرہ' مشہد و مقتل کربلاء' فتوح شام' فتوح مصر' ابو مختف' ابن قتیبہ ازدی' کلبی' واقدی وغیرہ ابتدائی مورخین ہیں۔ اس کے بعد ابن سعد' محمد بن اسماعیل بخاری وغیرہ کا عہد آتا ہے' اس کے بعد حمزہ اصفہانی یعقوبی' بلاذری وغیرہ کا دور شروع ہوتا ہے' پھر جس طرح محدثین میں بخاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے تمام مشائخ وار اور شہر وار حدیثوں کو ایک جامع صحیح میں جمع کر کے پوری اسلامی روایات کے ذخیرہ کو یکجا کر دیا۔ اسی طرح طبری پہلا شخص سن (302ھ) ہے جس نے تمام متفرق تاریخی رسائل و حوادث کو یکجا کر دیا۔ اور ساتھ ہی کوشش کی کہ ایرانی رومی واسرائیلی تاریخوں کو بھی جو اسلام سے پہلے تھیں اسلام کے ظہور کی تاریخ سے پہلے جمع کر دے تاکہ وہ پوری دنیا کی تاریخ ہو سکے' طبری چوں کہ محدثانہ مذاق کے آدمی تھے اسلئے ان کی کوششیں صرف جمع روایات تک محدود تھی لیکن مسعودی 340ھ حکیمانہ مزاج کا آدمی تھا' اس لئے اس کی تصنیفات کی جامعیت میں علمی اغراض و مقاصد بھی مد نظر رہیں گو اس کی اصلی کتاب انباالزمان ملتی نہیں تاہم مروج الزہب بھی مختلف حیثیتوں سے عربی میں دنیا کی پہلی جامع تاریخ ہے' اس کی کتاب التنبیہ والاشراف شرفائے خاندان کی سیاسی تاریخ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کن کن عرب خاندانوں نے اسلامی حکومتوں کے بنانے اور چلانے کے کیا کیا کام انجام دیئے مسعودی کے زمانہ تک یعنی ساڑھے تین سو صدیوں میں جو تاریخیں لکھی گئیں تھیں ان کا اندازہ اس سے ہو گا کہ مسعودی نے اپنی تاریخ مروج الزہب کے آغاز میں اپنی تاریخ کے اٹھاسی تاریخی ماخذوں کا حوالہ دیا ہے' دسویں صدی کے آغاز میں حاجی خلیفہ چلپی نے اپنی فہرست

کتب میں تاریخ کے نیچے کتابوں کے جو نام لکھے ہیں ان کی تعداد بارہ سو (۱۲۰۰) کے قریب ہے' جو عربی و فارسی و ترکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں حالانکہ یہ فہرست ناتمام ہے۔

فلسفہ تاریخ

فلسفہ تاریخ کے سلسلہ میں اگرچہ ابن خلدون کا نام سب سے روشن ہے مگر یہ سمجھنا کہ ابن خلدون نے بغیر کسی دھندلکے کے خود یک بیک یہ روشنی دفعتہً پیدا کر دی تدریجی ارتقاء کے اصول کے خلاف ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اصول محدثین پہلے پیدا کر چکے تھے ابن خلدون کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصولوں کو تاریخ میں رائج کرنے کی کوشش کی البتہ اس کی ایجاد اقلیمی خصوصیات اور سیاسی عصبیات اور اقتصادی مسائل کا تاریخ سے جوڑ پیدا کرنا ہے' اور اس میں بھی اولیت کا سراغ اس سے چار صدیاں پہلے ملتی ہیں' چنانچہ ابن مسکویہ نے اپنی تاریخ کا تجارب الامم نام رکھنا اس واقعہ کی غمازی کرتا ہے۔

ثقافتی تاریخ

ثقافتی تاریخ کے باب میں مقریزی کی کتاب الخطط والاثار سب سے اہم چیز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس پرداز پر اس نے یہ مصر کی تاریخ لکھی اس طرز پر اگر ہر اسلامی ملک کی تاریخ لکھی جاتی تو ہمارے پاس معلومات کا بڑا سرمایہ ہوتا۔

مسلمان جس ملک میں پہنچے اس کو منور کر دیا

مسلمانوں نے فن تاریخ میں جو ترقیاں کیں انکی ایک بین مثال یہ ہے کہ جس ملک میں بھی پہنچے اس کو تاریخ کی روشنی میں اجاگر کر دیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے اس ملک میں اندھیرا پھیلا تھا مسلمانوں نے آکر مشعل جلادی عرب' ایران'

مصر و شام و عراق مغرب' اسپین' ہندوستان' ہر جگہ ان کے دم قدم سے تاریخ کی روشنی ہے ورنہ اسلام سے پہلے کا سرمایہ افسانوں کہانیوں اور دیومالا کے سوا اور کچھ نہ تھا

عرب اور عجم مورخین کا فرق

عرب اور عجم مورخین کی ذہنی ساخت میں یا تو فرق ہے یا دونوں قوموں کی نسلی خصوصیات کا تقاضا ہے کہ عرب مورخ صرف شاہی درباروں میں مقید نہیں رہتا بلکہ وہ بازاروں میں بھی آتا ہے عوام سے بھی ملتا ہے علماء کی محفلوں میں بھی جاتا ہے مشائخ کے حلقوں میں بھی جاتا ہے' حکما اور فلاسفہ سے بھی اس کی علیک سلیک ہوتی ہے مگر عجمی مورخ شاہانہ قصر و ایوان اور شاہانہ درباروں سے بہت کم باہر نکلتا ہے' اور دوسرے اصناف انسان سے اس کی ملاقات اسی وقت ہوتی ہے جب وہ شاہانہ درباروں تک پہنچتا ہے' اسی لئے عربی تاریخوں میں جو وسعت ہے وہ فارسی تاریخوں میں نہیں' اور اسی کا اثر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان مورخوں کی تاریخ سلاطین کے حدود حکومت کی زنجیروں میں جکڑی ہے' البتہ شعراء نے اپنی بزم الگ سجائی تھی' مگر مشاعروں کی واہ واہ کے سوا وہاں کچھ اور نہیں سنائی دیتا اسی طرح مشائخ نے بھی اپنے حلقوں میں شمع نورانی جلائی مگر وہاں بھی حال و قال اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ انتہاء یہ ہے کہ ہزاروں لاکھوں علما' فقہا' محدثین' مفسرین حکماء' اور اطباء اور مہندسین کے تذکروں سے ساری بیاضیں خالی ہیں' اگر ایک میر غلام علی آزاد کی شخصیت آخر میں ظاہر نہ ہوتی۔ تو وہ اہل کمال جو درباروں تک پہنچ نہ سکے تھے ان کا نام و نشان بھی ہم نہیں سن سکتے تھے' یہی وجہ ہے کہ جہاں تک دوسرے ملکوں کے علما اور اہل کمال کے احوال کی واقفیت کا سوال ہے ہم ہندوستان کے اہل کمال سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں آخر میں ہمارے عہد کے مولانا سید عبدالحئی صاحب نے بارہ جلدوں میں ہندوستان کے علمائے اسلام کی تاریخ بڑی محنت سے مرتب کی' جس کی

اشاعت حیدر آباد کی قدر دانی پر موقوف تھی دو جلدیں اس کی چھپ گئیں باقی کیلئے دنیا اب منتظر رہے گی اور ڈر ہے کہ قلمی نسخہ دست برد زمانہ سے گم نہ ہو جائے کیا ہم یہ امید کریں کہ پاکستان کی قدر دانی ان کے تمام کاموں کو پورا کریگی جن کو ہندوستان کی اسلامی ریاستوں نے ناتمام چھوڑا ہے۔

مشرقی پاکستان کی تاریخ

مشرقی پاکستان کی گو بعض اسلامی یادگاریں جو پنڈوہ، لکھنوئی اور مرشد آباد میں واقع ہیں وہ مغربی بنگال میں شامل ہو گئی ہیں پھر بھی مشرقی پاکستان کی یادگاروں کی اہمیت اب بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ خود مشرقی بنگال کی تاریخ بہت کچھ تکمیل کی محتاج ہے ریاض السلاطین کے مختصر سے اور متاخر بیان سے عقدے نہیں کھلتے، بنگال کی خود مختار اسلامی سلطنت کا حال بہت کم معلوم ہے۔ قطب الدین نہروالی کی کتاب تاریخ امراء بلدۃ الحرام سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال کی اس اسلامی سلطنت کے بحری تعلقات حجاز سے وابستہ تھے اور وہاں بنگال کی اس اسلامی سلطنت کی طرف سے ایک مذہبی علمی درسگاہ قائم تھی، دوسری طرف اس سلطنت کا بحری تعلق مملکت ایران کے ساتھ قائم تھا جس کا مشہور عام واقعہ حافظ شیرازی کی بنگال آنے کی دعوت ہے۔ جس کے جواب میں حافظ نے وہ مشہور غزل لکھ کر بھیجی جس کا بہ زبان زد عام شعر ہر شخص کو معلوم ہے۔

شکر شکن شوند همه طوطیان هند زین قند پارسی که به بنگاله می رود

مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی بنگال کی سیر سے مشرف ہوا۔ اس نے لکھا ہے کہ ترکستانی ایرانی سیاح بنگال کو "جہنم پر از نعمت" کہتے ہیں۔ غالباً ان کا اس کو جہنم کہنا موسم کی سختی کے سبب ہوگا، مگر بہر حال "پر از نعمت" تو تھا اور بحمد للہ کہ بنگال کی یہ نعمتیں اب بھی قائم ہیں اور ان میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ آٹھویں صدی کے عرب جہازراں عرب ساحلوں سے چاٹگام آیا کرتے تھے اور اس کو وہ صادگام کہتے تھے۔ ابن بطوطہ نے

اس کو سد گاؤں لکھا ہے۔ عجب نہیں کہ اس کا ہندی نام ست گاؤں اور ست گرام ہوگا۔ گرام ہندی میں گاؤں کو کہتے تھے اور گاؤں گرام ہی کی شکل ہے جو اکثر ہندوستانی آبادیوں کے نام کا جز ہے' جیسے نگرام' لگرام' بلگام' آج کل انگریزی لب ولہجہ نے اس کو چٹاگنگ بنادیا ہے اور افسوس ہوتا ہے جب عربی اخبارات میں اسی غلط انگریزی تلفظ کی تقلید کی جاتی ہے۔ عربی جغرافیہ میں سلہٹ کا نام سلاہط ملتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں علما' فضلا اور اہل کمال کی بڑی تعداد گزری ہے' مگر افسوس ہے کہ ہندوستان کے اہل علم کے حلقہ تک ان کے نام نہیں پہنچے' قاضی رکن الدین سمرقندی کا ایک کارنامہ ملتا ہے جن کے فیض سے ایک ہندو جوگی نے جامع مسجد لکھنوتی میں اسلام قبول کیا اور اس نے ان کی خاطر کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ فارسی میں کیا جس کا نام ماء الحیات ہے اور اب اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے' مگر افسوس ہے کہ ان قاضی صاحب اور اس مترجم کے حال سے ہم ناواقف ہیں ہم کو یہ بھی معلوم ہے صوبہ بہار کے مشہور صوفی عالم و حکیم و محقق شیخ شرف الدین یحیٰ منیری نے اپنی تعلیم کا زمانہ بنگال میں بسر کیا اور یہیں اپنی تعلیم کی تکمیل کی' مگر افسوس ہے کہ ان کے ان نامور اساتذہ کے حالات سے ہم ناواقف ہیں جن کے دامن میں ایسا نامور فاضل عہد پیدا ہوا' ابھی ایک عزیز کے خط سے معلوم ہوا کہ لکھنوتی کے سلطان بغراخان کا درباری فارسی شاعر شمس دبیر اتنا مقبول تھا کہ امیر خسرو نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ بہت سے ایسے باکمال علما اور مشائخ روزگار ہیں جو مغربی پاکستان یا دہلی سے بنگال آئے اور یہیں رہ بس گئے جن میں سے شیخ علاؤالدین لاھوری بنگالی پنڈوی المتوفی سنہ 800 اور ان کے بیٹے شیخ نور الدین پنڈوی بنگالی المتوفی سنہ 813 مشہور ہیں' شیخ نور الدین پنڈوی بنگالی نے اپنے مکتوب میں ایک فارسی شعر کا ترجمہ کیا ہے فارسی شعر یہ ہے۔

ہمہ شب یزار یم شد کہ صبا نداد بوئے | ندمید صبح بختم چہ گنہ نہم صبا را
رین سب آج سویا سبخ ملا نھا نوں | پیو نیو چھے یا تری مجھ سہاگن نانوں

مجھے معلوم نہیں اس میں بنگالی زبان کا اثر کس قدر ہے۔

بنگالی زبان اور خط کا اسلامیت سے بُعد

بنگالی زبان پہلے تحریری زبان نہ تھی' یہ بنگال کے مسلمان سلاطین ہیں' جنکی کوششوں نے بنگالی زبان کو تحریری زبان بنایا' اور اس میں بعض کتابیں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں بنگالی ہندو مورخ مسٹر لا نے اپنی کتاب پروموشن آف لرننگ انڈر مسلم رول میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے' مگر مسلمان اس زبان کو عربی رسم الخط میں لکھتے تھے اور اس قسم کی پرانی قلمی کتابیں اب بھی موجود ہیں اگر یہ عمل انگریزوں کے عہد انقلاب میں بھی جاری رہتا تو آج اس صوبہ میں اسی طرح بنگالی اردو بولی جاتی جس طرح ہم گجراتی اردو اور دکھنی اردو اور بہاری اردو بولتے سنتے ہیں' مگر انگریزی عہد میں ہندو بنگالیوں نے انگریزی تعلیم میں سبقت کی اور بنگالی زبان کو جدید اصطلاحات اور محاورات سے سنوارا اور اوسکا رسم الخط ہندی کے قریب بنایا اور نئے الفاظ خالص سنسکرت ماخذ سے لینے لگے اور عربی و فارسی لفظوں کو زبان سے خارج کیا تو وہ ایک نئی زبان بن گئی جو خالص ہندو ذہنیت سے معمور ہو گئی جو سنسکرت الفاظ' ہندو دیوتاؤں اور دیومالاؤں اور خیالات سے لبریز ہو گئی' اور اسلامیت سے خالی ہو گئی۔ جب مسلمانوں نے نئی تعلیم حاصل کی تو یہی سنسکرتی بنگالی زبان انہوں نے سیکھی اور پڑھی اور وہی فصاحت و انشا پردازی کا معیار بن گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے مسلمان باقی ہندوستان کے مسلمانوں سے کٹ گئے اور ان تحریکات و اصلاحات سے بے گانہ اور ناواقف رہ گئے جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل رہے تھے اور ان کو ملت واحدہ بنا رہے تھے' اور افسوس ہے کہ یہ صورت حال اب تک قائم ہے۔ اور آج پاکستان کی تعمیر میں یہ اجنبیت اور بیگانگی خارج ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں بنگالی مسلمانوں کو سارے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ملت بننے کیلئے ضروری ہے کہ سارے پاکستان کا ایک ہی خط ہو اور وہ عربی رسم الخط نسخ ہے۔ جس میں پشتو' سندھی' اور پنجابی لکھی جاتی

ہے اس کا اثر یہ ہے کہ ان صوبائی زبانوں کے نہ جاننے والے عربی رسم الخط اور مشترک عربی و فارسی الفاظ کی بنا پر عبارت کا حاصل مطلب بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ اگر بنگال کے مسلمان بنگالی خط بدل لیں تو وہ سارے پاکستان کو ایک بنا سکتے ہیں اور قرآن کیلئے عربی رسم خط اور زبان کیلئے بنگالی رسم خط سیکھنے میں بچے دہری محنت سے بچ جائیں گے۔

اسلامی بنگال میں علما کا حصہ

اس وقت مشرقی پاکستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاحی تحریکات سے جو واقفیت اور آگاہی ہے اس کا ذریعہ عربی درسگاہوں کے علما اور طلبہ ہیں جو ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں جایا کرتے تھے اور بہت کچھ وہاں سے لیکر اپنے وطن کو واپس آتے تھے اور ان کو اپنے وطن میں پھیلاتے تھے۔ لیکن ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو مگر وہ انگریزی درسگاہوں کی تعداد سے بہت کم تھی۔ جو ان تحریکات سے واقفیت کو کوئی ذریعہ نہیں رکھتے تھے' کیونکہ وہ اردو سے ناواقف تھے اور ہیں اور انگریزی اس ذخیرہ سے خالی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کی تحریکات' مولانا اسماعیل شہید کی دعوت' سر سید اور علی گڑھ کی دعوت۔ ہندوستانی مسلمان مفکرین و مصنفین کے خیالات و افکار سے تاثر مشرقی پاکستان میں اسی لئے بہت کم ہے' اور اسلام کا یہ سب سے آباد خطہ اسلامی مرکزوں سے بالکل بیگانہ بنا ہوا ہے اور بنگالی کی دنیا کے اندر جس کی زمین و آسمان پر ہندو تخیل اور سنسکرتی تصورات چھائے ہوئے ہیں' وہ گھر کر رہ گیا اور ساری اسلامی دنیا سے کٹا ہوا ہے۔

مشرقی پاکستان میں ملت واحدہ کا تصور

پاکستان کی دعوت اس صورت حال کی اصلاح کی دعوت ہے' یہ مسلمان قوموں اور ملکوں کو ایک ساتھ ملا کر واحد ملت کی تشکیل کرنا چاہتا ہے' اس لئے ضرورت

یہ ہے کہ اس دعوت کی تکمیل کے لئے ہم اپنی تاریخ پر اصلاحی نظر ڈالیں اور اس کو اس صورت میں ترتیب دیں جس سے پاکستان کی دعوت کا مقصد پورا ہو۔

پاکستان کے مورخوں کا فرض

حضرات! پاکستان کے قیام کے بعد ملت کا ہر صاحب فن اپنی اپنی قوت و استعداد کے مطابق پاکستان کی تعمیر میں مصروف ہے' تجارتی' صنعتی' زراعتی' تعمیری' ادبی' عملی' سائنسی' فلسفی ہر گوشہ' علم و فن کے واقف کار پاکستان کی تعمیر میں مصروف ہیں' دوسرے اہل فن کے ساتھ ساتھ یہاں کے مورخوں پر بھی بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں تاریخ نویسی کے اس طرز کو بدلنا ہے جس کو انگریزی سیاست نے یہاں رائج کیا، جس نے ملک میں تفریق کا بیج بویا اور بجائے اس ملک کی بلندی اور رفعت کے انگریزی راج کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ اور عدل و انصاف اور بحالی امن و امان کی تشہیر کا کام اس فن سے لیا گیا' جس سے ملک خود اہل ملک کی آنکھوں میں ذلیل اور سات سمندر پار کے ملک ان کی نگاہوں میں معزز بنایا گیا' ملک کے پورے سابق عہد حکومت کو صرف تاریکی اور ظلمت ظاہر کیا گیا تاکہ انگریزی راج کا کارنامہ روشن نظر آئے' اور ان مکاریوں اور فریبیوں پر پردہ پڑ جائے جس کے ذریعہ سے بیرونی لوگوں نے اس ملک کی دولت و صنعت و حکومت پر قبضہ پایا۔

سابق فرامین شاہی کا سرمایہ

ہندو پاکستان کے تاریخی سرمایہ کا ایک بڑا اور اہم حصہ فرامین شاہی ہیں جو اب بھی ہندو مسلم ممتاز خاندانوں مندروں اور خانقاہوں میں موجود ہیں سر سید مرحوم کے زمانہ سے لیکر مولانا شبلی مرحوم کے عہد تک برابر اس کی تجویز مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کے جلسوں میں منظور ہوئیں اور کبھی ان کی نمائش بھی کی گئی مگر ابھی تک

یہ فراہم ہو کر اور آؤٹ ہو کر فوٹو اور تشریح و نقشہ کے ساتھ شائع نہیں ہوئے، اگر یہ فراہم ہو کر اور آؤٹ ہو کر شائع ہوں تو ہندو پاکستان کی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات منظر عام پر آجائیں۔

فن تاریخ کی تکمیل کے لئے پاکستان اور بھارت کا تعاون

حضرات! ہندو پاکستان کی تقسیم سے گو بہت سے سیاسی و انتظامی و تجارتی مسائل میں انقلابات پیدا ہو گئے ہیں، مگر جہاں تک علم و فن کا تعلق ہے وہ قوموں کی تقسیم سے تقسیم نہیں ہوتے، وہ پوری دنیا کی ملکیت ہیں اور وہ ایک دوسرے سے طبعاً وابستہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ تاریخ کہ وہ واقعات اور ان کے نتائج کا مجموعہ ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے اہل فن باہمی تعاون اور تفاہم سے اس کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہوں اور تاریخ کو علم کے بجائے سیاست کی شاخ نہ بنائیں اور واقعات کی تشریح و تفصیل میں ایسی راہ اختیار کریں جو صداقت سے دور نہ ہو اور دو ملکوں یا دو قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے بجائے دور سے دور تر نہ کریں۔

آل پاکستان ہسٹری کانفرنس کا یہ اجلاس ہمارے لئے ایک خوش آئند منظر ہے اور ہم کو اس سے ایک شاندار مستقبل کا چہرہ دور سے دکھائی دیتا ہے۔

(آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین)

سید سلیمان ندوی

27 فروری 1953ع